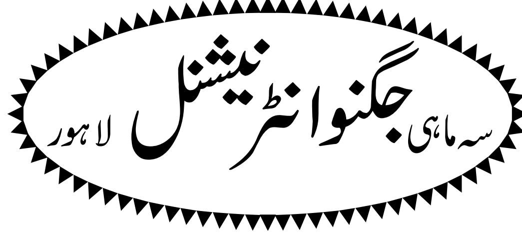
بیاد راؤ قاسم علی شہزاد (جگنو)



قیمت فی پرچہ	-/300 روپے
سالانہ قیمت	-/1200 روپے
بذریعہ ڈاک سالانہ	-/1800 روپے
بیرونِ ملک	-/100 ڈالر (امریکی)

باقر پبلی کیشنز، لاہور
+92334-7751095
+92300-8073510

حسنِ ترتیب

اداریہ

کسی تشنہ آرزو کی تکمیل ہونے لگے تو کپکپاتے گنگ لبوں اور نم آنکھوں کو سجدہء تعظیمی سے فرصت نہیں ملتی چہ جائیکہ حرف مدعا بیان کرے- ایسی ہی حیرت کی پیاس نے پورے وجود کو بنجر کر رکھا ہے ایسے میں کشتِ خامہ آئینہ خانوں کی نظارت کرتے کرتے اپنی زرخیزیٔ طبع کو آئینہ خانوں کی نظارت سونپ کر بہتے لہو کو منجمد کر کے من کی روسیاہی کے آبلوں کی سوا گت کرتے کرتے خود لہولہو ہو جاتی ہے۔ اس کی سرخی اس امید میں کہ یہ لہولہو فصل کسی زیتون کی ڈالی کی پرداخت کرے گی۔ جہاں کسی بلبل کے لب گلوں کی شکوہ سنجی کے منصب سے آزاد ہو کر خاروں کو بھی اپنی ہمنوائی کی سعادت سے معمور کریں گے۔ ایسے میں چراغ لالہ ان پھونکوں کا مرہون نہ ہوگا - خوشبو کا جھونکا کسی تعفّن کے ڈھیر کو بے توقیر نہ کرے گا۔ بلکہ اس کی چارہ جوئی کا بھرم یوں رکھے گا کہ وہ اپنی جبلت کو معنبر ساعتوں سے مصافحہ و معانقت کے قدموں کی دھول بنا کر اس کے ذّروں کو کسی سسّی کے قدموں میں باندھ کر عشق کا عین تحریر کرے گا ۔ یہ عین ہی تو ہے جو گاہ قلب و جگر کی روشنی بن کر گاہ ٹوٹے گھڑے کی آبرو بن کر کسی دودھ کی نہر نکالنے والے تیشے کی یوں پذیرائی کرتا ہے کہ "ش" اور" ق" اسے گلے لگانے کو بےقرار ہو جائیں ۔آج صورتحال یہی ہے ۔لہولہو گلستان ہیں، نمدیدہ چمنستان ہیں، طائروں کے لبوں پہ نغموں کا چیستان ہے۔سُدی کا آنچل بھی تار تار ہے۔گل کو گل سے ہی خار ہے۔انجمن دل فگار ہے ۔ایسے میں ظلمتوں کے انگار آتش ابراہیمی کا سندیسہ لا کر پھول کھلانے کی نوید لاتے ہیں- ہماری یہ ادنیٰ سی سعی بھی مرادوں کے کنول گٹھڑی میں باندھ کر دم بخود خوشبوؤں کے کوچے میں سرنگوں ہے۔معطر و معنبر ساعتوں کی سفارت کا بھرم رکھنے کے لئے ۔خدا کرے 2020 اس بھرم کا طواف کر کے نگار خانۂ دل کی طہارت اس

سجدۂ تعظیمی کو ادا کرنے کی سعادت حاصل کر کے دلِ کافر میں ایمان کی مشعلیں روشن کر کے صرصر کو صبا کا ہمنوا بنا دے۔

سالِ نو 2020 کی اولین ساعتوں میں ''سہ ماہی مجلّہ جگنو انٹرنیشنل'' آپ کے ہاتھوں میں دعوتِ امن، محبت اور دوستی کا پیامبر بن کر دبستانِ ادب کی گلفشانی کو مہک زار کرنے کی سعادت ان لمحوں میں حاصل کر رہا ہے جب علم و ادب وثقافت کی پہچان، پھولوں کے شہر، پنجاب کے دل "لاہور" کو عالمی ادارہ اقوامِ متحدہ کی طرف سے "ادبی شہر" قرار دیا جا چکا ہے۔ بلاشبہ اب ہم شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کی ذمہ داری بھی دو چند ہو گئی ہے کہ ہم اس اعزاز پہ صرف اترائیں نہیں بلکہ خود کو اس کا اہل ثابت کرنے کے لئے اپنی علمی، ادبی، تحقیقی، صحافتی ذمہ داریوں کو گروہ بندی اور سیاسی ولسانی آلودگی سے پاک رکھنے کے لئے اپنی صلاحیتیں وقف کریں۔ صرف وقتی ناموری کی چکا چوند سے آنکھیں متحیّر کرنے کے لئے نہیں بلکہ قلب و نظر کی تطہیر سے نئے آسمانوں اور نئی زمینوں کی طرف پرِ پرواز وا کرنے کے لئے۔ اس امید کے ساتھ کہ اس پرواز کے نقوش ہمیشہ انمٹ ہو کے نسلوں تک راہنمائی کرتے رہیں گے۔ یہی زندگی کا مقصد ہے اور یہی وقت کی پکار ہے۔ اور یہی کمالِ فن کی معراج۔۔

کمالِ فن نے مرے جب سے مجھ سے ملوایا
رہی نہ فکر مجھے عمرِ رائیگاں کے لئے

ایم زیڈ کنول۔ لاہور
چیف ایڈیٹر۔ سہ ماہی مجلّہ جگنو انٹرنیشنل
چیف ایگزیکٹو۔۔ علمی، ادبی، سماجی وثقافتی روایات کی امین تنظیم، جگنو انٹرنیشنل

ایوب خاور، لاہور

دعا

مرے مولا!
بہت مدّت سے اپنے خواب لکھنے کا ہنر میں بھول بیٹھا ہوں
کئی مہتاب، سورج اور ستارے ہیں
کہ جو دیوارِ جاں کے ساتھ ٹوٹے آئینوں کی
طرح سر نیوڑھائے لٹکے ہیں
کسی آئینے کے ٹکڑے میں کوئی وصل کا لمحہ سلگتا ہے
کسی میں ہجر کا زنگار، حرف و سطر کی ترتیب سے عاری
کسی ٹکڑے کی نکڑ میں
برہنہ خامشی اوندھی پڑی ہے اور کسی آئینے کے بے وزن دروازے
کی چوکھٹ سے لگی بدنام تنہائی، خود اپنے ضبط کے ٹکڑے چباتی
ہے، نسوں میں سُوکھے جنگل کی ہَواؤں کی طرح سے سنسناتی ہے
ادھورے، اَونے پَونے زاویوں سے
دل کی دھڑکن اپنے سَم کو ڈھونڈنے کی سعیِ لا حاصل میں
لے کی انتہائی تیز گردش سے الجھ کر رہ گئی ہے، سم نظر آتا
نہیں، اک پل ٹھہرنے، سانس لینے، خود سے کوئی بات
کرنے، سطرِ غم کے سائے میں کچھ دیر اپنی نیند چننے کا کوئی
موسم نظر آتا نہیں مولا!

کہیں ایسا نہ ہو
میری سماعت کھو گئی ہو
یہ بھی ہو سکتا ہے، لے، اپنی ہی قائم کردہ قوسیں توڑ کر
بے تال ہوتے ہوتے یک جائی کی کوشش میں کسی ہم زاد
کا پلّو پکڑتی ہو مگر پلّو پکڑنے میں نہ آتا ہو!
کہیں سَم ہاتھ میں آ آ کے گرتا ہے
کہیں لے، تال سے ٹکرا کے گھٹتی اور بڑھتی ہے
یہی کچھ ہے
مرے اندر، مرے باہر یہی کچھ ہے
بہت دن سے کوئی شے اپنے سَم پر آ نہیں پائی
ہَوا خوشبو سے
خوشبو رنگ سے اور رنگ، پیراہن سے باہر ہے
عجب اک گردشِ ترتیب و بے ترتیب ہے
جس میں پیالہ اپنی مٹّی میں سلگتا ہے، ہتھیلی پر رکھوں تو ٹوٹ
جاتا ہے، نظر کے آئینے میں کوئی منظر کاڑھنے سے پہلے منظر
ٹوٹ جاتا ہے، سمندر ریت کے، اُڑ اُڑ کے چہرے پر برستے
ہیں مگر آنکھیں چھلکتی ہیں نہ سینے میں کوئی کوندا لپکتا ہے
عجب دل ہے
عجب اک برف کی سِل ہے جو روز و شب کی چکّی میں
مسلسل پس رہی ہے، پھر بھی اپنی ذات میں سیّال
ہونے میں نہیں آتی

اگر سیّال ہو بھی جائے تو میں
اِس کی سیّالی کو کس اظہار کے سانچے میں ڈھالوں!
ربِّ حرفِ مدّ عا! مجھ کو تو لگتا ہے مرا اسلوب
چوری ہو گیا ہے اور میں کارِ دگر میں ہوں
میں جس کارِ دگر کی گہری دلدل میں کھڑا خود سے الجھتا ہوں
وہاں چاروں طرف سورج کی نقالی ہے
ٹھنڈی چاندنی کی گرم، نیلی روشنی ہے، کیمرے ہیں اور
کمپیوٹر ہیں، وی سی آر ہیں، کردار ہیں اور مردہ
لفظوں کی جگالی کرنے والے...... بولنے والا ہے کوئی اور
لکھنے والا کوئی اور ہے، دن......ایک دن میں اِس
جگہ بے انت دن، بے انت راتیں، دن میں راتیں
رات میں دن، صبح وشامِ زندگی، سب کچھ، سبھی کچھ
اُلٹا پلٹا ہے، ابھی کچھ تھا......ابھی کچھ ہے
مکھوٹوں سے اُدھر کچھ اور ہے
پردے سے باہر اور ہے، پردے کے پیچھے اور ہے اور ان
کے بیچوں بیچ اک گرد و غبارِ ہجر میں لپٹی ہوئی
آنکھیں ہیں، چہرا ہے، ہزیمت اور ندامت کی سیہ بُکّل
میں صحراؤں کے صحرا باندھ کر بیٹھے ہوئے، دُوری کے
ٹیلے سے پرے، کچھ خون کے رشتے ہیں اور میں ہوں
مرے دامن میں خوشبو ہے
بہت سی اَن سِلی خوشبو

جسے پیراہنِ رخصتِ ہنر کرنا ہے
لیکن کیا کروں مولا!
تھکن کی بوندیاں مجھ ناتواں کی زرد مٹی میں
تسلسل سے ٹپکتی جا رہی ہیں، سَم نظر آتا نہیں
کس زاویے سے خود کو خود سے جوڑ کر دیکھوں
ابھی تو مجھ کو اپنی ان سِلی خوشبو کو سینا ہے
مجھے بھی کچھ کشیدہ کار حرفوں اور کچھ سطروں کے
ریشم کی ضرورت ہے مرے مولا!
مرے مولا!
اگر اِذنِ ہنر دے تو یہ دل
اس دل کی دھڑکن اپنے سَم پر لوٹ آئے اور یہ
جو اِک برف کی سِل ہے، جو روز و شب کی چکی میں
مسلسل پِس رہی ہے پھر بھی اپنی ذات میں سیّال
ہونے میں نہیں آتی، اچانک میرے لہجے کی لپک
بن کر ٹپک جائے
مرے اندر کوئی ایسا
سخن انداز ہو جائے جو میری نظم کو شفاف
دریا کی روانی دے، مرے پیرائیہ اظہار کو
گنجِ معانی دے
بہت مدّت سے اپنے خواب لکھنے کا ہنر میں بھول بیٹھا ہوں

نسرین سیّد، کینیڈا

مناجات

مجھ پہ جو فرض ہے، وہ قرض ادا ہو، آمین
میری قسمت میں محمدؐ سے وفا ہو، آمین

نہ طلب مال کی ہو اور نہ ہوس دنیا کی
میرا دل روضۂ اقدس کا گدا ہو، آمین

جب بھی دنیا کے مصائب مجھے گھیریں آقا
آپؐ کا نام ہی بس ردّ بلا ہو، آمین

سیدھے رستے سے جو دنیا مجھے بھٹکانے لگے
سنّتِ شاہِ امم، راہ نما ہو، آمین

سُوئے فردوس اگر چشمِ تصور دیکھے
باغِ زہراؑ ہو کِھلا، پُھولا پھلا ہو، آمین

وہ جو ہر ایک ضرورت سے میری واقف ہے
میرا مولیٰ، میرا حاجات روا ہو، آمین

ایم زیڈ کنول، لاہور

حمد و ثنا

ابرِ رحمت کی مجھ کو گھٹا چاہیے
مجھ کو مولا تری ہی عطا چاہیے
ہم غریبوں کی چارہ گری کیجیے
ربِّ کعبہ مدد بخدا چاہیے
ہم مسِ خام ہیں کیجئے کندن ہمیں
خوشبوؤں کو کنول کی قبا چاہیے



ڈاکٹر فہیم رضا کاظمی، اُچ شریف بہاولپور

لائقِ حمد و ثناء ذاتِ خداوند کریم
خالقِ ارض و سماء رازق و رحمٰن و رحیم
منعم و رب علاقادر و قدوس وکریم
مالک ِ روز جزاء عادل و اعلیٰ وعظیم
نور کی اس کے ہر اک سمت فراوانی ہے
ذات ہے اس کی احد واحد و لاثانی ہے

ایم زیڈ کنول، لاہور

نعتِ رسول مقبول ﷺ

اپنے عشاق میں کر لیجئے شامل مولا ﷺ
میں کسی اور نہیں عشق کی قائل مولا ﷺ
دنیا داری تو کبھی تھی ہی نہ اس دل کا حصول
یہ تو بس آپ ﷺ کی الفت پہ ہے مائل مولا ﷺ
آپ ﷺ کے روضے کو چومیں مری آنکھیں اے کاش
بس اسی شوق میں جیتا ہے مرا دل مولا ﷺ
اک طرف دھند ہے تو دوسری جانب طوفان
ہر طرف مشکلیں رستے میں ہیں حائل مولا ﷺ
مرے لفظوں نے بھی نہ مجھ کو پذیرائی دی
اتنا پڑھ لکھ کے بھی واللہ ہوں جاہل مولا ﷺ
آپ ﷺ سے کرتی ہوں فریاد مسیحائی کی
ٹکڑے ٹکڑے ہے جسد روح بھی گھائل مولا ﷺ
اپنے خوابوں کی چتا کاندھے پہ رکھ لائی ہوں
ان کا تعبیروں سے کر دیجئے واصل مولا ﷺ
داؤ پہ سارے ہی سکّے میں لگا بیٹھی ہوں
نہ ملا پھر بھی مرادوں کا وہ حاصل مولا ﷺ
آپ سے آج بھی رہتے ہیں کنول شرمندہ
کیجئے اتنا بھی نہ اب ان سے تغافل مولا ﷺ

اکرم کُنجاہی، کراچی

تنقید: تیقن کی حقیقت یا گمان کا سراب

دیگر بہت سی اصنافِ سخن کی طرح مغربی ادب کے زیرِ اثر ہمارے ہاں جو خوش گوار اضافے ہوئے اُن میں تنقید نگاری کا فن بھی ہے۔ حالی سے پہلے ہمارے ہاں آفاقی ذہن کا کوئی تنقید نگار دکھائی نہیں دیتا۔ تنقید نگار کسی فن پارے کی وضاحت کرتا ہے، تنقیص یا تعریف کرتا ہے، تقابلی جائزہ لیتا ہے، اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور بعض صورتوں میں تخلیق کار کے مقام اور مرتبے کا تعین بھی کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا اعلیٰ سطح کا تحقیقی کام ہوتا ہے جس کے لیے علمی و مطالعاتی بصیرت ہی نہیں، ژرف نگاہی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

تنقید نگاری کے حوالے سے ہمارے ہاں بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں کہ تنقید کو یہ کرنا چاہیے اور وہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے عہد میں ایک عمدہ مثال ''دال دلیے'' والا کالم بھی ہے۔ ظفر اقبال صاحب نے کسی کی تعریف کر دی تو شاعر شہد لگی اس سند کو چاٹتا رہتا ہے، اُس کی عکسی کا پیاں گھر گھر بانٹتا ہے۔ مگر معاملہ اُس کے برعکس بیدل حیدری، رفیع الدین راز، باصر سلطان کاظمی، رفیق خیال، افضال نوید، شبیر نازش، اور ماجد جہانگیر مرزا کی کتب یا شاعری جیسا ہوا تو اُس پر ایک مختلف ردِعمل کا اظہار سامنے آتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ تخلیق کار اپنی تخلیق کا سب سے پہلا نقاد خود ہوتا ہے، تنقیدی نگاہ کے بغیر کوئی عمدہ فن پارہ وجود میں نہیں آتا۔ اسی طرح ایک تخلیقی اور تحقیقی ذہن کے بغیر کوئی شخص اچھا تنقید نگار نہیں ہوسکتا۔

اِس کے باوجود تنقید کوئی سائنسی حقیقت نہیں ہوتی جسے تجربہ گاہ میں پرکھا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی میں ہمارے تنقید نگاروں نے کبھی تخلیقات میں محاسن اور معائب تلاش کیے،

کبھی تخلیق کا دیگر تخلیقات سے موازنہ کیا، کبھی اُس کی جمالیاتی اور کبھی افادی پہلو پر بات کی اور کبھی موجودہ عہد کی طرح اپنے تاثرات بیان کر دیئے۔ لہٰذا تنقید نگار کی رائے محترم ہونے کے باوجود درست بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ سفّا کانہ اظہار خیال نے قارئین کو صدمے سے دوچار کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے صاحبانِ علم کئی مقامات پر تنقید نگار سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ تاریخِ ادب میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ تنقید نگار یا کسی تخلیق کار نے کسی بڑے شاعر وادیب کے فکر وفن سے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کیا جسے پڑھ کر ادب کے پڑھے لکھے سنجیدہ قارئین حیرت زدہ ہو گئے۔ اِس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم انگریزی زبان کے ممتاز تنقید نگار ٹی ایس ایلیٹ کی یہ خوبصورت بات فراموش کر دیتے ہیں کہ جس طرح ایک مجرم کے جرائم کی فہرست دیکھ کر مجرم کو اُس کے سب سے بڑے جُرم پر سزا دی جاتی ہے، اُسی طرح ایک تخلیق کار کے مقام ومرتبے کا تعین کرتے وقت اُس کی بہترین تخلیق کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

تاریخِ ادب پر سرسری سی نگاہ بھی ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کلامِ ربّانی کے سوا کوئی کلام معائب سے مبرّا نہیں ہے۔ کہیں میر جرات کی چوما چاٹی سے مایوس، کہیں ڈاکٹر عندلیب شادانی رئیس المتغزلین حسرت موہانی کو باقاعدہ تضحیک کا نشانہ بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ کلیم الدین احمد غزل کو نیم وحشی صنفِ سخن قرار دیتے ہیں تو عظمت اللہ خان کہتے ہیں کہ غزل کی گردن ہی مار دینی چاہیے۔ کسی کو میر کے ہاں امرد پرستی نظر آتی ہے تو کسی کو ناسخ کے ہاں پست خیالی دکھائی دیتی ہے۔ کسی کو سودا کی قصیدہ گوئی پر اعتراض ہے تو کوئی ذوق کی شاعری کو بے رنگ اور تغزل سے تہی دامن کہتا ہے۔

''جمہوریہ'' میں اخلاقیات کا دعویدار افلاطون ''ہومر'' جیسے استاد، بلند مرتبت شاعر بلکہ المیہ ڈرامہ نویسوں کے سرخیل کو جس طرح تختۂ مشق بناتا ہے، وہ حیران کُن ہے۔ بظاہر اُس کی تنقید وتنقیص کا موضوع شعراً کی پوری جماعت ہے مگر ہدفِ تنقید تو بہرحال ہومر ہی بنا ہے۔ اُردو شاعری میں میر کی عظمت مسلم ہے۔ وہ شعر میں ریاضت کے ساتھ ساتھ سوز و

گداز اور دردمندی کو لازمی قرار دیتے تھے۔لہٰذا اُن کا خیال تھا کہ ایک سپاہی شعر نہیں کہہ سکتا کہ اُس کا دامن اِن جواہر سے تہی ہوتا ہے۔میر کی اِس بات سے ہرگز اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

نکتہ پردازوں سے اجلافوں کو کیا

شعر سے بزّازوں ، ندّافوں کو کیا (میر)

تذکروں میں بھی اہم تنقیدی اشارے ملتے ہیں۔اِس سلسلے میں شیفتہ کا ''گلشنِ بے خار'' بہت اہم ہے۔موصوف عوامی آدمی نہیں تھے اور شاعری کو بھی عوامی ہُنر خیال نہیں کرتے تھے۔وہ شعر و ادب کو فنِ شریف کہتے اور نجابت و شرافت کا ایک جز و سمجھتے۔کلاسیکی نظم وضبط اور متانت کو لازمی عنصر مانتے تھے۔بعض شعرا کو وہ پورے طور پر سمجھ ہی نہیں سکے۔ انہوں نے سفّا کانہ انداز میں نظیر کے کلام کو سوقیانہ کہہ کے اِس بنیاد پر رد کیا کہ اُن کے اشعار بازاری لوگوں کی زبان پر تھے۔ان کے کلام میں ابتذال تھا، رکاکت تھی۔نظیر کا تو کچھ نہ بگڑا مگر اِس برہمیت نے شیفتہ کو ایک مخصوص عہد اور سماج کا تنقید نگار بنا کے رکھ دیا۔خواجگی کے یہ ایوان وقت گزرنے کے ساتھ خود ہی زمین بوس ہو گئے، ادب صرف اُن ایوانوں ہی سے نہیں بارگاہوں، مسجدوں اور درباروں سے بھی باہر آ گیا۔حالی سے پہلے، وہ بہترین تنقیدی شعور رکھنے کے باوجود، اِس رویے سے انہوں نے خود اپنا نقصان کیا۔

جوش ملیح آبادی کا ایک خط جو حکیم آزاد انصاری کے نام تھا۔ادبی مجلّے ہمایوں بابت جنوری ۱۹۴۲ میں شائع ہوا۔خط لکھتے وقت نجانے جوش کس کیفیت میں تھے کہ انہوں نے اپنے عہد کے ایک نامور شاعر فانی بدایونی کو بیوۂ عالم، سوز خواں، ہر وقت بسورنے والا اور انسانیت کے درجے سے گرا ہوا قرار دیا۔''نگار'' بابت جنوری فروری ۱۹۴۱ میں بھی ایک مضمون ''اُردو کا رنگِ تغزل'' میں فانی سے متعلق کچھ یوں

درج تھا۔''فانی کی غزل گوئی ایسی ہی ہے جیسے چوٹ کھائی ہوئی، بجھی ہوئی طبیعت کو کُرید کُرید کر خاک کے ڈھیر سے چنگاریاں اُڑائی جا رہی ہیں۔باقیات اور عرفانیات کو ہمدردی اور قدر دانی سے پڑھ چکنے کے بعد کائنات اور حیات بجائے کوئی وسیع ڈرامائی

کیفیت رکھنے کے بہت چھوٹی چیز معلوم ہونے لگتی ہیں۔فانی کا شیوۂ تسلیم و رضا، محاسن کائنات و حیات کا احساس پیدا نہیں کرتا۔اُن کے ہاں تحیّر ہے نہ تحیّر کی سپردگی، محبت کی تلخیاں ان کے ہاں شدید سے شدید تر تلخ سے تلخ تر ہوتی گئیں لیکن شاید مے کہنہ کی بجائے تیزاب ہو کر رہ گئی ہیں'' کلیم الدین احمد فانی کے مداح ہونے کے باوجود معترف ہیں کہ غالب کی دنیا وسیع، فانی کی تنگ ہے۔اُن کے اسالیب کی دلکشی، اُن کی تنگ دامانی کو نہیں چھپا سکتی۔مجنوں گورکھپوری کے نزدیک، اُن کے مسلسل شیون و فریاد سے ناخوش گوار تاثر پیدا ہوتا ہے اور اُن کی شاعری میں تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہوگئی ہے۔

حالی نے سابقین کی شاعری کو بالعموم اور طرحی کلام اور مشاعروں میں پڑھی جانے والی شاعری کو بالخصوص شعر و قصائد کا ناپاک دفتر قرار دیا تھا جس میں جھوٹ، کذب، فضیحت اور رسوائی کے علاوہ اور مضامین کم ہی نظر آتے تھے۔کیا حالی سے کلی طور پر اتفاق ممکن ہے؟

غالب پرستی یا یوں کہیے کہ غالب کی کورانہ تقلید کی جس شخصیت نے سب سے زیادہ مخالفت کی اور ''غالب شکن'' کہلائے وہ مرزا یاس یگانہ چنگیزی ہیں۔یہ مخالفت اس قدر تھی کہ تاریخ نے اُن کی غالب شکنی کو تو یاد رکھا مگر خود اُن کی اپنی شاعرانہ عظمت، کلام کی اعتدال پسندی اور توازن کو بھلا دیا۔ہوسکتا ہے کبھی زمانہ اُن کی غالب شکنی کو فراموش کر دے اور اُن کے علم و فضل کا اعتراف کیا جائے جس کے وہ بجا طور پر مستحق ہیں۔رنگِ تغزل کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نیاز فتح پوری ''انتقادیات'' میں لکھتے ہیں ''غالب کا اُردو کلام بہت تھوڑا ہے اور اُس میں بھی رنگِ تغزل چوتھائی حصہ سے زیادہ نہیں۔مومن نے البتہ بہت کہا اور خوب خوب کہا۔اُن کے لطیف اشارے کنائے، اُن کی شیریں تراکیب الفاظ، سوز و گداز اور باوجود عشق بازاری کے اُن کے خیالات کی بلندی اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔طرزِ ادا کا تو حقیقت یہ ہے بادشاہ تھا۔غالب کے کلام کا ایک حصہ تو وہ ہے جسے فارسی کے کلیات میں شامل ہونا چاہیے'' ناسخ سے متعلق علامہ نیاز فتح پوری یوں رقم طراز ہیں ''ناسخ نے غزل گوئی کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔قدرت اگر سرزمین اودھ سے جلال کو پیدا نہ

کرتی تو دورِ ناسخ کے گناہوں کا کفارہ ممکن ہی نہ تھا''

میر، درد اور سوز کے حوالے سے علامہ نیاز فتح پوری کا خیال یہ ہے کہ زبان کی لحاظ سے تینوں ایک ہی درجہ رکھتے ہیں، کیوں کہ اُن میں سے کسی نے اصلاح کی طرف توجہ نہیں دی اور کلام میں بہت سے نامانوس الفاظ پائے جاتے ہیں۔ البتہ درد اور سوز کے ہاں ایہام کی شاعری بالکل نہیں ہے مگر میر کے ہاں یہ عیب بھی نظر آتا ہے۔ مزید براں امرد پرستی کا جذبہ بھی میر کے ہاں اپنے عہد کے اکثر شعرا سے زیادہ نمایاں ہے لیکن بہ ایں ہمہ معیارِ تغزل کے اعتبار سے کسی عہد میں اُس کا نظیر پیدا نہیں ہوا۔۔۔۔۔'' غزل کو ۱۹۳۹ میں نیم وحشی صنف کہنے والے کلیم الدین احمد ''اُردو شاعری پر ایک نظر'' میں ان ہی شعرا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میر اور سودا کا کلام ظاہر کرتا ہے کہ اِن شعرا میں اعلیٰ پائے کا غزل گو ہونے کی صلاحیت موجود تھی اگر وہ مغربی ادب کا مطالعہ کرتے۔۔۔۔''

انجم اعظمی ''ادب اور حقیقت'' میں لکھتے ہیں ''جن دنوں معین احسن جذبی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اُردو میں پڑھایا کرتے تھے، وہ اکثر اپنے لیکچر میں حالی کو غالب سے بڑا شاعر ثابت کرنے کے درپے رہتے اور بتاتے کہ فلاں فلاں اعتبار سے حالی بڑا شاعر ہے (جو اُن کی تحقیق کا موضوع بھی تھا)۔ یہ بات جب وہ صدرِ شعبہ رشید احمد صدیقی کے سامنے کہتے تو وہ مسکرا دیتے۔ فوراً موضوع بدل دیتے اور اُن سے کہتے ''جذبی صاحب! غالب کو چھوڑیں کوئی تازہ نظم کہی ہے تو سنائیں'' اسی کتاب میں انجم اعظمی اپنے استاد رشید احمد صدیقی کی عظمت اجاگر کرنے کے لیے جب اُن کا موازنہ تاریخِ ادب کی دیگر نامور شخصیات سے کرتے ہیں تو اُس میں دوسروں کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہے۔ رقم طراز ہیں'' شخصیتوں کے خاکے اُن سے بہتر اُردو ادب میں نہیں لکھے گئے، اُن کی مرقع نگاری کے مقابلے میں مولوی عبدالحق کی ''چند ہم عصر'' ایسی خشک اور بے جان نظر آتی ہے جیسے کسی نے اُس کی روح سلب کر لی ہو' فرحت اللہ بیگ اور پطرس بخاری سے اُن کا موازنہ یوں کرتے ہیں:۔ ''فرحت اللہ بیگ کی ظرافت کا انداز رشید احمد صدیقی کے لیے روایت سہی لیکن اُس کا

دائرہ بے حد محدود ہے، رشید صاحب نے اس فن میں ہندوستان کی سماجی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی زندگی کو سمیٹ کر اسے سمندر بنا دیا ہے۔ پطرس صرف ہنسنا ہنسانا جانتے ہیں، وہ کھلنڈرے ہیں اور طالب علمانہ ذہنیت رکھتے ہیں، اُن کی شگفتگی کی تہہ میں رشید احمد صدیقی کی طرح اعلیٰ سنجیدگی نظر نہیں آتی۔ اوروں کے مقابلے میں پطرس کی تحریر زیادہ مہذب ہے لیکن اِس کا ہلکا پن صاف نمایاں ہے، دراصل اُس آدمی کو لکھنے کا آغاز ہی نہیں کرنا چاہیے جو محاسن تحریر کو درجہ کمال تک پہنچانے سے پہلے ہے لکھنا ترک کر دے''

ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''اُردو کا تنقیدی ارتقا'' میں مولانا محمد حسین آزاد کو پہلا نقاد قرار دیا ہے جن کے ہاتھوں نظریاتی مباحث کا آغاز ہوا۔ مگر کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر احسن فاروقی نے اُن پر بڑے اعتراضات کیے ہیں۔ کلیم الدین احمد ''اُردو شاعری پر ایک نظر'' میں لکھتے ہیں آزاد و حالی میں مغربی ادب سے ناواقفیت کی بنا پر بہت سے اہم نکات سے محروم رہے اور نظم کے صحیح مفہوم سے آشنا نہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ''اُردو تنقید کا ارتقا'' میں کلیم الدین احمد کو جذباتی اور بدگمان قرار دیا ہے۔

وزیری پانی پتی نے سلیم احمد سے متعلق ایک عمدہ بات کہی ہے: ''سلیم احمد جو اسلامی نقاد اور دانشور کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں، ایک زمانے میں عجیب و غریب شعر کہتے تھے، جو میری فہم و فراست سے بالاتر تھے۔ گویا انہیں پرانے الفاظ، بلکہ مکروہ الفاظ کی شراب نئے پیالوں میں پینے پلانے کا شوق تھا''۔ مشاعرے کا شاعر عمومی طور پر سامعین کی پسند کا خیال رکھتا ہے۔ رئیس فروغ مشاعرے کے شاعر نہ تھے، اس لیے اُن کی غزل کا ایک مخصوص لہجہ تھا جو اُن کی شخصیت کے کلام میں مکمل طور پر سما جانے سے پیدا ہو گیا تھا۔ لہٰذا کچھ اخباری ناقدین خاص طور پر سلیم احمد ''رات بہت ہوا چلی'' کی منظومات و غزلیات میں جدید حسیت کے فقدان پر خوب بات کی لیکن جلد یہ تراشے وفات پا گئے۔ حضرت عبدالعزیز خالد کئی زبانوں پر دسترس رکھتے تھے، بڑے عالم انسان تھے مگر اُن کی مشکل پسندی ضرب المثل ہے۔ وزیری پانی پتی بہ یک وقت اُن کی تعریف و تنقیص اِن الفاظ میں کر رہے

ہیں ''خالد کی شاعری میں الفاظ کی غرابت اور نا مانوسیت سخت تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے۔مشکل یہ ہے کہ وہ خود اپنے وسیع علم اور مطالعہ کی وجہ سے اِن الفاظ اور تراکیب سے بے حد مانوس ہیں۔لیکن ہلکے پھلکے تغزل اور مدحِ رسول ﷺ کے معاملے میں اتنے گراں بار الفاظ کا استعمال نہ ہونا چاہیے''اسی طرح ماضی قریب میں ایک صاحب امیر حسنین جلیسی نے ''بُت خانہ شکستم من'' میں استادِ گرامی راغب مُرادآبادی جیسے بے مثل عروض دان اور ماہر لسانیات کے کلام میں سے فنی اغلاط تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ماہنامہ ''افکار کراچی۔مارچ ۱۹۵۴ء'' میں حمایت علی شاعر کا ایک مضمون شائع ہوا۔ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:
''ندیم! ایک اچھے شاعر ہیں۔لیکن آج کل اُن کی بڑائی کا چرچا جس انداز سے کیا جا رہا ہے، وہ ذرا سنجیدگی کے خلاف ہے۔مولانا عبدالمجید سالک جیسے جہاں دیدہ بزرگ ندیم کا تعارف کراتے ہوئے یہ تحریر فرمائیں کہ ''ایشیا کے اُفق پر ایک عظیم شاعر نمودار ہوا ہے'' تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔مولانا نے اگر ''عظیم'' کے لفظ پر غور نہیں کیا تو کم از کم ''ایشیا'' کی وسعت ہی کو پیشِ نظر رکھتے، شاید اس وسعت میں موصوف کو ندیم کی انفرادی حیثیت کا احساس ہو جاتا''

یہ بات اُردو ادب کے قارئین جانتے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا، مجید امجد سے بے پایاں عقیدت رکھتے تھے۔آغا صاحب نے مجید امجد کی شاعری کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیتے ہوئے، انہیں غالب اور اقبال کے ہم پلّہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔مگر وارث علوی نے ادبی وضع داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجید امجد چند اچھی نظموں کے شاعر ہیں۔غالب اور اقبال کا تو ذکر ہی کیا، وہ راشد، فیض اور اختر الایمان کے مقام کو بھی نہیں پہنچتے۔

الغرض ناہمواری بڑے سے بڑے کاملینِ فن اور اساتذہ سخن کے ہاں بھی موجود ہے۔مولانا ظفر علی خان نے کیا عمدہ بات کہی تھی

جب خدا خود بھی نہ لوگوں کی زباں ہی سے بچا
ہم ہیں پھر کون کہ ہم پر کوئی الزام نہ ہو

ایم زیڈ کنول، لاہور

آبروئے دیارِ سخن

(ڈاکٹر عبدالغفار عزم ......لندن)

شاعری صرف الفاظ کی مرصع سازی کا نام نہیں بلکہ یہ تخیل کی پرواز، جذبے کے گداز اوراحساس کی غمازی کا نام ہے۔ شاعر اپنی آنکھ میں دجلہ، دل میں صحرا، ذہن میں کائنات اور ہتھیلی پر چاکِ مشاہدات لئے جب بزم آرا ہوتا ہے تو اس کی انگلیوں کی پوروں پر کائنات رقص کرتی ہے، کبھی وہ قاری کو ایسی وادی میں لے جاتا ہے جہاں چاروں اور محبت کا جھرنا قلقاریاں بھرتا ہے، کہیں وحشتوں کا رقص، کہیں درد کی بانسری، کہیں یاد کی اپسرا، کہیں خواب کی دلربائی اور بزم آرائی کا سامان ہے۔ ڈاکٹر عبدالغفار عزم کی شاعری نئے امکانات اور رجحانات سے آراستہ نئے طرزِ فکر اور منفرد اسلوب کے ساتھ ''نقش اول'' بن کر لوحِ ادب اپنی پہچان کے نقوش ثبت کرنے کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ جہاں فکری تقاضے بھی ہیں اور فنی امور کی پاسداری بھی اور لفظوں کے دروبست اور ان کی پکار کا پورا پورا ادراک بھی ہے۔ وہ اپنے جذبات واحساسات اور دلی کیفیات پورے فنی رچاؤ کے ساتھ قاری تک منتقل کرنے کے ہنر سے نہ صرف آشنا ہیں بلکہ اپنی آنکھ کی پتلی پر کہکشاں، سانسوں میں مہکتا ہوا دبستان، ہاتھوں میں اجالے کا چیستان لئے ہوئے، اماوس کی تیرہ شبی، حبس کی مجاوری اور ظلمتوں کی عیاری سے نبٹنے کا عزم ان کے ایک ایک مصرعے سے عیاں ہے۔ مصرعے بھی کیا ہیں گویا تراکیب و خیال کا چمنستان، اِدراک و آگہی کا دبستان اور خوابوں کا ایک جہان ہے۔ یہ خواب وہ ہے جس کو بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی آنکھوں میں بسایا، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، آتش داغ، جگر، غالبؔ، فیضؔ، ساحر، ناصرؔ، نے اپنے لہو سے سینچا۔ ڈاکٹر عبدالغفار عزم نے بھی کئی عشروں سے اردو تحریک عالمی کے نام سے ادبی

دنیا کی ایک مقبول اور جانی پہچانی انجمن کے بانی کی حیثیت سے اس کی خشتِ اول سے لے کر تزئین تک، خود ایک معمار کی طرح عرق ریزی کی ہے۔ ان کے جذبوں کی سچائیوں نے انہیں محبتوں اور ریاضتوں کا تاج محل بنادیا ہے۔ چوالیس سال کی اس سیادت نے انہیں ایسا پارس بنادیا ہے کہ جو اِن کے قریب سے بھی گزر جائے وہ سونا بن جاتا ہے۔ آج کی نفسا نفسی اور ادبی طوائف الملوکی کے دور میں ڈاکٹر عبدالغفار عزم نہ صرف خود چمنِ ادب کو اپنے لہو سے سینچ رہے ہیں بلکہ اس کی بہار کو سدا بہار کرنے کے لئے " دیارِ مغرب "، میں مشرقی روایتوں کے فروغ کے لئے ساری دنیا سے گوہرِ نایاب چُن چُن کر ایک ایسی منفرد بستی بسائے بیٹھے ہیں جس کی آبادکاری جغرافیائی سرحدوں سے بے نیاز ہے۔ ساکنانِ شعر وسخن دنیا کے جس گوشے میں بھی آباد ہیں اس بستی کی شہریت اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہیں۔ جس کا نہ کوئی رنگ ہے، نہ نسل، نہ مذہبی قدغن ہے نہ جغرافیائی حدود، جہاں گاگر اور ساگر میں کوئی تفریق نہیں۔ اِس کی بنیاد رکھنے سے لے کر آج تک سخنورانِ ادب کے لئے آپ ایک شجرِ سایہ دار بن کر سایہ بھی دے رہے ہیں اور ٹھنڈک بھی، خوشبو بھی اور طراوت بھی، اور پھر قطب ستارے کی طرح میرِ کارواں بن کر سرگرمِ عمل ہیں۔

نہیں دشت و بیاباں میں بھی تنہا اس کے دیوانے
جہاں جاتے ہیں اک بستی بسا لیتے ہیں اردو کی

....

پردیس میں بھی کر نہ سکا دور زمانہ
اردو ہے ہماری تو ہیں ہم اردو کی پہچان

....

نکہت سے مہک اٹھا ہے جو دشتِ غیر عزؔم
بو باس کیا بلا کی یہ اردو زباں کی ہے

....

سنوارے سنبھالے گئے کچھ کہ ایسے
یہ گیسوئے اردو ہیں برہم نہ ہوں گے

یہ بات طے شدہ ہے کہ ذات کا اظہار یہ ہو یا معاشی و معاشرتی استحصال کی تصویر کشی ،حسن و عشق کے معاملات ہوں یا وارداتِ قلبی، شعرائے اردو نے ہمیشہ ''غزل'' کا ہی ا نتخاب کیا۔کم و بیش تمام شعراء جو شعر گوئی کی ودیعت سے فیضیاب ہیں،ان کی محبوب صنف غزل ہی ٹھہری۔ڈاکٹر عبدالغفار عزم نے بھی اس صنفِ سخن کی ترویج کے لئے ریاضتوں کا ایک آسمان تسخیر کر کے اپنے اطراف میں اِک ایسا جہانِ محبتاں آباد کیا ہے جہاں شہرِ سخن کی شہزادی اپنے پورے شکوہ کے ساتھ بزم آرا ہے۔کیوں نہ ہو اس لہلہاتے پھول کی نکہت و طراوت سے چہار دنگِ عالم میں گلستانِ ادب کو شادابیوں اور جولانیوں کا سامان کرنے والے ڈاکٹر عبدالغفار عزم ایک شاعر ہی نہیں بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں اور دبستانِ دہلی و علیگڑھ کی روایتوں کے امین ہی نہیں علمبردار بھی ہیں ۔آپ کی شاعری بھی انہی روایتوں کی ترجمان ہے ،جہاں جمالیات بھی ہے، کلاسیکیت بھی، محبت بھی اور انسانیت بھی۔آپ مصرعوں کی ایسی بُنت کاری کرتے ہیں کہ آپ کے نوکِ قلم سے آراستہ ہر لفظ قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کر کے اسے رکنے پر مجبور کر دیتا ہے، ہر سطر محبتوں کی سحر کاری سے قاری کو ایسے طلسمِ ہوشربا میں لے جاتی ہے کہ اس کے قدم تو کیا وہ سارے کا سارا پتھر ہو جاتا ہے۔حیرانی کا آسیب رگ و پے میں اتر کر اس پتھر کو جب جونک لگا تا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ گوشت پوست کا انسان تو حساسیت کے آسیب میں سحر زدہ اپنی زمین اور اپنی زبان کی تلاش کا متمنّی ہے۔

پھولوں کی مہک رنگِ غزل، کیف کا عالم
ہم اپنی زمیں، اپنی زباں ڈھونڈ رہے ہیں

....

کچھ جان لیا کرتے ہیں کیسے لکھی کس نے
راقم کی تو خوبو کا پتہ دیتی ہے تحریر

....

کرے دار اسکا مقدم اسے موت کیا ستائے
سرِ ظلم جس کو آئے سرِ دار مسکرانا

آپ کا تخلص ہی عزم نہیں بلکہ یہ تو آپ کے جنون کا استعارہ ہے۔جس نے نقشِ اول اورحرفِ آخر کی بھی تمیز روا نہ رکھی۔

نقشِ اوّل بھی وہ ہوا نہ ہو
حرفِ آخر جسے لکھا ہوگا

....

جنوں ہے جذب میں وجدانِ انتہائے شعور
سجتی صلیبیں ہوں گیں، گزریں گے ہم جدھر سے

....

دیکھیں چلیں کہاں تک نکلے تو ہم ہیں گھر سے
دیکھیں تو ہم آفاق پر چھانے کو چلے ہیں

....

باقی پہ ابھی ذات کے اندر کا سفر ہے
عالم کی سیر تک ہی نہ جستجو ہو تیری

کلیم الدین احمد کہتے ہیں۔،،شاعری اور زندگی میں ناگزیر تعلق ہے۔وہ کہتے ہیں کہ شاعر کو زندگی سے موڑ ناجائز نہیں۔اگر اُس نے زندگی سے رُوگردانی کی تو اُس کی شاعری کی دُنیا محدود ہوکر رہ جائے گی۔

ڈی ایچ لارنس بھی اپنے مضمون Whistling of Birds میں اس حقیقت کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''ہمارا وجود زندگی کے لئے ہے یا موت کے لئے اور یہ کہ یہ دونوں قوتیں یکجا نہیں ہوسکتیں۔ زندگی کی پہچان تو اس کے آدرش سے ہے''۔ ڈاکٹر عبدالغفار عزم بھی سفرِ زیست پر گامزن سوتے جاگتے اپنے آدرش اور سپنوں کی ایک دنیا آباد کئے ہوئے ہیں۔ اندر کے سفر نے ان کی آنکھوں کے آگے سے فریب کے سارے پردے ہٹادیئے ہیں۔ انہیں یہ ادراک ہے کہ

جو بجلیوں نے نہیں، اپنی سوزشوں نے کیا
ہمیں نے آگ لگائی ہے آشیانے کو

....

ہو عیب ہنر میں نہ کوئی سوچے تو کیسے
ہر عیب ہی میں کوئی ہنر دیکھتے ہوتے

....

ہے ٹھہرا تیز رو ہونا یہاں آداب کا دشمن
قدم آہستہ راہِ شوق میں آہستہ آہستہ

....

وہی جانے کچھ کہ ہے سوز کیا جو کہ سازِ دل پہ لٹائے جاں
اُسے آئے کیا جسے آئے نہ غمِ زندگی سے لگائے دل
جو چلا لگی کا ہے سلسلہ نہ رکا کہیں بھی ہے کارواں
بڑھا شوقِ راہِ تلاش جو کبھی کم ہوئی نہ بلائے دل

اپنی زمین کی مٹی، اس کی خوشبو ان کے من میں بسی ہے۔ ہجرت کا الاؤ دھیمے دھیمے سلگتی ہوئی چنگاری بن کر ان کے سوزِ ہجر کو جلا بخشتا ہے۔ یہاں آپ ایک نفسیاتی تجزیہ کار کی طرح فطری جبلت اور اس کے تقاضوں کو زیرِ بحث لاکر انسانی نفسیات کی توجیہہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

بھولتے نہیں ہجرت میں وہ لگاؤ مسکن سے
کچھ پرندے گھر اپنے دن ڈھلے اترتے ہیں

درد وغم کے صحیفے جنہیں میرؔ کہتے ہیں کہ درد وغم جمع کیا ہے تو دیون ہوا ہے۔ڈاکٹر عبدالغفار عزم کا فلسفۂ غم رجائی ہے اس میں قنوطیت نہیں بلکہ زندگی سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔قضا کو اوڑھے ہوئے بھی زندگی نکلتی ہے اور وہ پکار اٹھتے ہیں۔

مری روداد غم گرما اٹھی ہے ٹھنڈے دل کتنے
سنا جس دل جلے نے کہہ اٹھا ہے داستاں میری

....

درد و غم کو کہتے ہیں کیفِ زندگی کا راز
ہم پہ بھی صحیفے کچھ غیب کے اترتے ہیں

....

نفس نفس سے جو حسرت کی چیخ سی نکلی
قضا کو اوڑھے ہوئے دیکھا زندگی نکلی

ہجرتوں کا نوحہ، رتجگوں کی صلیبیں پہنے زندگی کی رعنائیوں کو بے رنگ کر گیا۔جب بزم ہی اپنی نہ رہی تو کیف وسرور کیسا؟؟ایسی صورت میں جہاں اجنبیت کا ناسور، حبس اور گھٹن کی مجاوری، بے رُخی و بیگانگی کا تابوت ہو، وہاں نگار خانۂ دل کی ویرانی لازمی امر ہے۔

اپنی سی ہوا کیف، نہ ہی بزم اپنی سی
ہم کو دیارِ غیر میں کیسی گھٹن لگے

....

کرنا ہے غم کو آساں حصہ دوانگی کا
بدلیں نہ بیخودی سے عنوان زندگی کا

....

ایک لمحہ جس کو ملتا زندگی کا نام بھی
موت کا اس خواب ہی میں آتا ہے ہنگام بھی

....

کاروبارِ شوق میں جی جان سے رکھنا قدم
لگتا ہے اس راہ میں سانسوں کا سرمایہ بہت

زندگی پر پھولوں کا ہی نہیں کانٹوں کا بھی حق ہے۔مسرت وانبساط کے لمحے تو لمحاتی ہیں ۔اصل میں تو غم ہے جس سے زندگی عِبارت ہے۔فیض احمد فیض اس حساس نکتے کی صراحت یوں فرماتے ہیں۔

''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔اس کے بعد زندگی کی رواں دواں کیفیت اور اس کی موآجی کا حال یوں بیان کرتا ہے۔،،نظامِ زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا سنگ بستہ مقیّد پانی نہیں ہے، جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔آگے چل کے کہتے ہیں ،فنکار محض زندگی کا شاہد ومصّور ہی نہیں بلکہ وہ زندگی کو اگلی منزل تک پہنچانے والا بھی ہے۔یہ چیز طالب ہے جہد وعمل اور امید ویقین کی۔ڈاکٹر عبدالغفار عزم کے ہاں زندگی اپنی پوری رعنائی کے ساتھ سانس لیتی ،دل دھڑکاتی نظر آتی ہے۔جہاں سفینہ طوفان سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتا ہے۔

ضد میں اپنی تھا اٹل طوفاں بھی، مانی ہار کب
وہ سفینہ سے برابر دیکھ ٹکرایا بہت

....

کائناتِ حسن فانی جو پسِ تصویر ہے
زندگی نکتِ نظر میں موت سے تعبیر ہے

ڈاکٹر عبدالغفار عزم کی شاعری زندہ جذبوں،لطیف احساسات کی شاعری ہے جس کی روایات اس کے تمام اشارے،علامتیں، رمزیت اور رعایت اپنے تمامتر جوبن پر

ہیں۔ یہاں حسن وعشق اوراس کے معاملات بھی ہیں اور شعور کی فراوانی بھی ،نئی امنگوں اور نئے ولولوں کے چراغ بھی ہیں۔

آپ کی غزل گوئی کی سب سے نمایاں خصوصیت آپ کا انفرادی لب ولہجہ ہے۔وہ خود کہتے ہیں کہ وہ بے شمار آئینے رکھنے کے باوجود خودکوان میں عیاں نہیں پاتے۔یہ ان کے فکر کی پرواز ہے جو جہاں تک بھی پہنچے الہام یا صحیفہ نہیں ہوسکتا۔اس میں وہ تلمیحی انداز اپناتے ہیں جب اہلِ عرب نے قرآن کے الٰہی پیغام کوشاعری کہا تو ربّ کریم نے سورہ کوثر کی صورت میں انہیں چیلنج کیا۔

جائے ہے لوحِ صفا سے کاٹتی حرفِ غلط
نقد کی کاری قلم وہ بے جگر شمشیر ہے

....

پرواز فکر کی ہے جو پہنچے جہاں تلک
الہام یا صحیفہ تو کہتے نہیں اُسے

محسن نقوی نے''عذابِ دید'' کے دیباچے میں لکھا ہے۔

''سارے شہر میرے اپنے شہر ہیں،۔۔۔ہر دل کی دُھڑکن میری شہ رگ کا اثاثہ اور سینے کا زخم میرے وجود کا سرمایہ ہے مقتل کوسجانے والا ہر سر کشیدہ میرے قبیلے کا فرداور ہر سر بُریدہ مظلوم میرے لشکر کے سردار کی حیثیت رکھتا ہے،میری سوچ میرے جیسے ہر انسان کی وراثت ہے۔۔۔میری شاعری کسی ایک خطّے کی آب وہوا کے حِصار میں اسیر نہیں،نہ ہی کسی ایک فرد کے فِکر وعمل کی عکّاس ہے بلکہ جہاں جہاں امن کی خوشبو، فاختاؤں سے اَٹی فضا،انمول محبت کے سائے اور چاہتوں کے آبشار نغمے برسا رہے ہیں وہاں وہاں میری غزلوں کی دھنک،میری نظموں کی رعنائیاں اور میرے مرثیوں کی کسک اپنی بازگشت سمیت پھیلنے اور بکھرنے کے عمل میں مصروف ہے''

ڈاکٹر عبدالغفار عزم کی شاعری بھی آفاقیت کا آسمان سایہ فگن کئے، جہانِ آرزو آباد

کرنے کی دھن میں سرشار محبتوں کا استعارہ ہے۔یوں لگتا ہے یہ دیباچہ محسن نقوی نے ڈاکٹر عبدالغفار کے لئے ہی لکھا ہے۔ سچ بھی تو یہی ہے محبتوں کے طائر ایک ہی آسمان تلے محوِ پرواز ہوتے ہیں ، پڑاؤ کریں یا کوچ ،سمت بھی ایک ہوتی ہے اور منزل بھی ۔ڈاکٹر عبدالغفار عزم کا کلام اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔آپ انسانیت کے علمبردار ہوتے ہوئے انسانیت کی عظمت کے مداح ہیں۔آپ ہم آہنگی ،محبت ،حسنِ سلوک ،انسانیت اور آدمیت کو توقیر اس طرح دیتے دکھائی دیتے ہیں کہ تمام رشتوں کو ''الف'' سے ''ی'' تک کی زنجیر میں مربوط کر کے موتیوں کی مالا میں پرو کر عظمتِ انسانی اور اس سے وابستہ قدروں کو دوام بخشتے ہیں۔

بند تو بند کھلی آنکھوں میں بھی حسرتِ خلد
خواب تو خواب ہیں بہر حال سرابوں سے رہے

....

سلسلے ہیں سبھی رشتوں کے "الف" سے "ی" تک
حرف کب عزمؔ معانی سے جدا رکھتے ہیں
فسانے میں فسونِ غیب کے دونوں برابر ہیں
اُنہیں الہام ہوتا ہم پہ جو پارے اترتے ہیں

....

گر وہ قلم فروش نہیں بت فروش ہے
کہ پیکرِ صنم کے لئے جو لگائے دام

ایسا نہیں کہ آپ جدت اور نئے پن کی طلب میں ماضی کو ''خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا اور سُنا افسانہ تھا'' کی طرح بھلا دیں ،بلکہ اپنی روایت سے پیوستگی اُمیدِ بہار کا موجب جانتے ہیں۔اندر اور باہر کا خلفشار انہیں برسرِ پیکار رکھتا ہے۔پرواز کو اونچی نگاہوں کی بلندی درکار ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ہم نے جو تاج محل تعمیر کیا ہے۔اس سے خونِ تمنا کی بہت سی یادیں

وابستہ ہیں۔

ریت لازم ہے روایت کی نبھانے کے لئے
بدلے انداز بھی ہوں بدلے زمانے کے لئے

....

وابستہ کئی خونِ تمنا کی ہیں یادیں
ہم تاج محل اور ہی تعمیر کئے ہیں

....

پیامِ نو ہے لئے تیرگئ کوہنہ عزم
کہ صبح شام کے سائے ہو جیسے اوڑھے ہوئے

....

بہا کرتا ہوں قطرہ قطرہ خوں ہو
سمندر ہی سمندر بھر چلا ہوں

....

وفا کے تو سورج کا مشرق نہ مغرب
ہر اک سمت ہی اس کا جلوہ ہے دیکھ

....

پردیس کاٹنے گئے افلاس، گاؤں چھوڑ کر
مایوس لوٹے کچا بھی گھر نہ وہاں ملا

....

دیر و حرم تو بکنے لگے ہیں زماں کے ہاتھ
گھر دل سا جائے نہ کہیں نیلام کے لئے

دیارِ غیر میں رہ کر اپنی شناخت، اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنی روایتوں کا علَم تھامے محوِ

سفر ہیں۔اردو زبان کا عشق ان کی روح میں اُترا ہوا ہے۔

آپ کی شاعری میں سماجی کرب کے ساتھ ساتھ معاشی و معاشرتی استحصال، جبر و انا کے ساتھ ساتھ انسانیت، رواداری اور محبت کے موضوعات اپنی تمام تر موضوعیت کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دِلاتے ہیں۔

آئیں غم خواری کو مقصود بندگی کر لیں
دردِ دل کو ہی نہ مطلوبِ زندگی کر لیں

....

طوفانِ بلا درپے ہوتے تو بجھانے کو
ننھا سا دیا دل کا جلنے میں لگا رہتا

....

لکھا کرتیں جو سطحِ آب پر لہریں حوادث کی
سفینہ کی جبیں پر سرخی اس کا عکس دیتی ہے

....

منزل کے آگے شوق کو ہو کر پتہ نہ ہو
اس نے کمال کر دیا اپنے کما ل کا

کمال سے صاحبِ کمال ہونے تک کا سفر آپ کو مبارک ہو۔ بلاشبہ آپ نے نئے ڈھب سے پرانی راہوں کے پیچ وخم سنوارے ہیں۔آپ کا یہ ذوقِ سفر جاری وساری رہے اور خوابوں کا نگر آباد رہے۔آمین!

گزر جاتے ہیں ذوقِ شوق میں ہر حدِ فاصل سے
نیا اک آسماں ہر ہر قدم تسخیر کرتے ہیں

سرور عالم راز، امریکہ

احمد علی برقیؔ اعظمی کی غزلیہ شاعری

(ایک تجزیاتی مطالعہ)

بخشا خدا نے برقؔ مجھے ایسا مرتبہ
سایہ بھی جب پڑا تو مرا روشنی کے ساتھ

جب جناب رحمت الٰہی برقؔ اعظمی صاحب نے یہ شعر کہا تھا تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ اس شعر کی تعبیر ان کے صاحبزادے احمد علی برقیؔ اعظمی بحیثیت ایک شاعر کی شکل میں دُنیائے اُردو کے اُفق پر ظاہر ہو کر ان کی یاد تازہ کر جائے گی۔ رحمت الٰہی برقؔ صاحب اپنے وقت کے ایک صاحب طرز اُستاد شاعر تھے۔ ان کے مجموعہ کلام ''تنویرِ سخن'' کا سرسری مطالعہ بھی ان کی شاعرانہ مقام اور بلند پایہ صلاحیتوں کے اثبات وتصدیق کے لئے کافی ہے۔ اُردو کا ایک بہت بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ہر زمانہ میں اس میں خدا جانے کتنے بلند پایہ، صاحب علم اور منفرد رنگ کے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے اور عمر بھر شعر و ادب کی بھرپور اور بے لوث خدمت انجام دے کر اِس حالت میں راہئ ملک عدم ہو گئے کہ اہل اردو نے نہ تو ان کی زندگی میں ان کی اور ان کے فن کی مناسب قدر کی اور نہ ہی ان کے بعد انھیں یاد رکھنے کی طرح یاد رکھا چنانچہ آج بیشتر اُردو دنیا ان کے نام اور کام دونوں سے مطلق ناواقف ہے۔ جناب رحمت الٰہی برقؔ مرحوم بھی ایسے ہی شاعروں میں سے تھے۔ زیر نظر کتاب ''روحِ سخن'' ان کے صاحبزادے احمد علی برقیؔ اعظمی کی شعر گوئی کا عکاس ایسا مجموعہ ہے جو اُن کے فن و فکر کی روشنی سے دنیائے اردو کو منور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر رحمت الٰہی صاحب آج زندہ ہوتے تو اس کتاب کو دیکھ کر یقیناً بہت خوش ہوتے کیونکہ یہ مجموعہ نہ صرف ان کے شعری ورثہ کی صحت اور زندگی کا ایک جیتا جاگتا ثبوت ہے بلکہ احمد علی برقیؔ صاحب

کے ہاتھوں خود بھی ایک نئے اندازِ فکر و بیان کی ابتدا کی ایک نیک فال کی حیثیت رکھتا ہے۔

برقیؔ صاحب کی شاعری ایک سیدھے سادے، شریف النفس انسان کی سیدھی سادی شاعری ہے جس کو ہر صاحب دل سمجھ سکتا ہے اور محسوس بھی کر سکتا ہے۔ اس شاعری میں غزل کا کوئی مخصوص رنگ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس میں نہ تو مرزا غالبؔ کی پیچیدہ خیالی اور فلسفہ ہے اور نہ میر تقی میرؔ کا سا حزن و ملال، نہ ناسخؔ کی استادی ہے اور نہ داغؔ کی سادہ بیانی اور معنی آفرینی، نہ جگرؔ مرادآبادی کی سرشاری ہے اور نہ فانیؔ بدایونی کی قنوطیت اور گریہ و زاری۔ یہ شاعری انسانی جذبات و خیالات کا ایک عام سا اظہار ہے جس کو غزل کے سکہ بند اصولوں اور پیمانوں پر پرکھنا تحصیل لا حاصل کے مترادف ہوگا۔ اس میں ہر شخص کو اپنا دکھ درد، اپنی امید اور حوصلہ، اپنی ناکامی اور نامرادی، دنیا کے ہاتھوں خود پر گزرے ہوئے حالات و حادثات اور ایک عام انسان کی عام زندگی کے معمولات نظر آئیں گے اور یہی اس شاعری کی انفرادیت اور خصوصیت ہے۔ اگر شاعر کے ساتھ قدم بقدم چل کر وہ ذہنی سفر کیا جائے جو اس شاعری کا منبع ہے تو اس سے لطف اندوز اور مستفید ہونا بہت آسان اور خوشگوار ہے۔

''روحِ سخن'' پر ایک سرسری نگاہ ڈالئے تو جو چیز اس میں فوراً نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کی سادہ بیانی اور بوجھل الفاظ و تراکیب کا بڑی حد تک فقدان ہے۔ جو لوگ برقیؔ صاحب سے واقف ہیں ان کو کتاب میں موصوف کی شخصیت اور اخلاق و کردار کا عکس نظر آئے گا اور ان کے کلام کی سادگی اور پرکاری میں خود برقیؔ صاحب کار فرما دکھائی دیں گے۔ کتاب کا مطالعہ قاری کے لئے مختلف سطحوں پر خوشگوار اور خوش آئند ہے۔ اگر اس مجموعہ کا مطالعہ تفصیل اور دقتِ فکر و نظر سے کیا جائے تو صاحب کتاب کی غزلیہ شاعری کے چند ایسے مزید پہلو سامنے آتے ہیں جو اہل دل کو غور و خوض، تنقید و تنقیح اور تجزیہ و تحلیل کی دعوت دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں برقیؔ صاحب کی غزل کے کچھ منفرد اور دلکش نقوش اجاگر ہوتے ہیں جو کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ اجمال کچھ تفصیل چاہتا ہے۔

غزل کے لغوی معنی ''اپنے محبوب سے باتیں کرنا'' ہیں۔ اس حوالے سے عشق کی وفا

شعاری، حسن کی بے وفائی اور غفلت شعاری، عاشق و معشوق کے کچھ اصلی اور کچھ فرضی قصے ،معاملات و واردات اور اسی قبیل کے دوسرے مضامین غزل کے عام اور معروف موضوعات میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ لیلیٰ اور مجنوں، شیریں اور فرہاد، سسّی اور پنوں کے اصلی اور فرضی قصے ،گل و بلبل، گلشن و گل چیں، قفس اور صیاد کی کہانی ، بہار و خزاں کا فسانہ، دنیا کی بے ثباتی اور انسانی زندگی کے صبر آزما حقائق اپنی تمام تفصیلات اور تلازموں کے ساتھ صدیوں سے غزل کی روایات کا ایک نہایت دلچسپ اور بیش بہا حصہ بنے ہوئے ہیں۔ غزل کا تصور کیجیے تو ایسے سب خیالات ،تصورات، تجربات، مشاہدات اور محسوسات ہماری نگاہ عشق پرست کے سامنے آ جاتے ہیں جن کا تعلق عشق اور معاملات عشق سے کسی بھی صورت میں ہوسکتا ہے۔ پھر یہی عشق کبھی اپنے مجازی روپ میں ہماری تنہائیوں کا ساتھی ہے اور کبھی عشق حقیقی کے روپ میں ہمارے دکھ، درد کا مرہم بن جاتا ہے۔ اُردو کے پہلے معروف شاعر وؔلی دکنی سے لے کر آج تک اُردو کی تاریخ میں ایک بھی شاعر ایسا نہیں گزرا ہے جس نے غزل کے ان معروف و مقبول موضوعات کو نظم کرنے میں تکلف سے کام لیا ہو بلکہ کچھ اساتذہ تو عاشقانہ معاملات پر اس قدر زور دیتے ہیں کہ ایسے مضامین اور طرز فکر ہی ان کی شناخت بن گئے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شعرا نے اِن عاشقانہ مضامین کو صرف براہ راست ہی اپنی غزل میں ایک دلچسپ اور جذباتی موضوع کی طرح استعمال نہیں کیا ہے بلکہ شیریں و فرہاد، گل و بلبل، بہار و خزاں، ہجر و وِصال، صحرا نوردی اور سیر گلشن غرضیکہ ہر نفس شعر کو تشبیہ، استعارہ، اشارہ اور کنایہ کی طرح بھی باندھا ہے گویا کسی نہ کسی صورت سے یہ موضوعات ان کی غزلیہ شاعری کا چھوٹا یا بڑا جز و ضرور رہے ہیں۔ اب یہ صورت حال اتنی عام ہے کہ غزل اور عاشقانہ مضامین لازم و ملزوم ہو کر رہ گئے ہیں گویا ایک کا تصور دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔

درج بالا حوالے سے اگر برقؔی صاحب کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو ایک عجیب اور نہایت دلچسپ حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اُردو غزل کے

محبوب موضوعات حسن وعشق کی کارفرمائی، گل وبلبل کے افسانے، شیریں وفرہاد کے قصے، دنیا کی بے ثباتی اور کم سوادی، آشیانہ اور قفس، بہاروخزاں، تصوف ومعرفت وغیرہ ہیں۔عام خیال یہ ہے کہ غزل کی شعریت، تغزل، اثر پذیری، معنی آفرینی، ایجاز واعجاز، داخلیت و خارجیت غرضیکہ ہر وہ خصوصیت یا انفرادیت جو اس کو بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب''اردوشاعری کی آبرو'' کا مقام عطا کرتی ہے اِنھیں بنیادی موضوعات سے نمو پاتی ہے اور انھیں سے سیراب ہوتی ہے۔اگر غزل سے یہ نکال دئے جائیں تو وہ خشک ، بے رنگ اور بے آب وگیاہ ہوکر رہ جائے گی۔اردوشاعری کے کئی صدی پر محیط دَور میں ایک بھی شاعر ایسا نہیں گزرا ہے جس نے اپنے کلام میں ان معاملات عشق سے کسی سطح پر احتراز برتا ہو۔غزل کے دوسرے مضامین بھی اکثر و بیشتر یا تو براہ راست یا پھر اشارہ ، کنایہ اور تشبیہات و استعارات کی صورت میں انھیں سوتوں سے پھوٹتے ہیں اور غزل کو اس کی صدرنگی سے مالا مال کرتے ہیں۔اس حقیقت کے پیش نظر اگر برقیؔ صاحب کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حیرت انگیز بات منکشف ہوتی ہے کہ انھوں نے غزل کے ان پرانے ، آزمودہ اور روایتی موضوعات سے تقریباً مطلق پرہیز کیا ہے۔ایک غزل کے بعد دوسری غزل پڑھتے جایئے تو اِن موضوعات پر ایک آدھ شعر''بقدر بادام'' نظر آجاتا ہے اور وہ بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔دوسرے مضامین والے اشعار کی فراوانی میں ایسے روایتی اشعار گم ہوکر رہ گئے ہیں۔مثال کے طور پر گل، گلشن، قفس، بہاروخزاں کو ذہن میں رکھ کر''روحِ سخن'' کا مطالعہ کیجئے تو گنتی کے چند اشعار دکھائی دیتے ہیں جن کے عمومی رنگ کی عکاسی نیچے دی ہوئی مثالوں سے بخوبی ہوتی ہے۔

سبھی نالاں ہیں جورِ باغباں سے
چمن کی درہم و برہم فضا ہے
گل و بلبل دَریدہ پیرہن ہیں
نہیں یہ ظلم ہے تو اور کیا ہے

مرادل خزاں کا شکار تھامجھے انتظار بہار تھا
مگر آئی فصل بہار جب مرے بال و پر وہ کتر گئے

....

بہار میں بھی عیاں ہیں خزاں کے اب آثار
جسے بھی دیکھئے لگتا ہے سوگوار مجھے

....

غنچے چمن میں آج ہیں یہ سر بریدہ کیوں
گل پیرہن ہیں باغ میں دامن دَریدہ کیوں

....

یہ کون باغباں ہے یہ کیسا نظام ہے
بارالم سے برگ وشجر ہیں خمیدہ کیوں

....

گلوں کی چاک دامانی کا منظر دیکھ کر اکثر
لبوں پر اہل گلشن کی شکایت آہی جاتی ہے

برقیؔ صاحب کی غزل کے مطالعہ کے بعد ذہن میں دوسوال ابھرتے ہیں۔ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں غزل کے روایتی مضامین یعنی عشقیہ معاملات و واردات سے اتنامکمل احتراز کیوں برتا ہے؟ دوسرے یہ کہ ان مضامین کی کمی کو انہوں نے کس طرح پورا کرنے کی کوشش کی ہے؟ پہلے سوال کا جواب تو شاید برقیؔ صاحب خود بھی نہ دے سکیں حالانکہ روایتی مضامین کے نہ باندھنے سے خود اُن کی شاعری کو کسی فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا ہے کیونکہ اس طرح انہوں نے اپنے اوپر مضامین کا میدان نہایت تنگ کردیا ہے اور سامنے کے مضامین نیز یکسانیتِ زبان وبیان کو کلام میں کھل کھیلنے کا موقع فراہم کردیا ہے۔میرا خیال یہ ہے کہ یہ احتراز صاحب موصوف کی زود گوئی اور بسیار گوئی کا

شاخسانہ ہے۔ وہ غزل کا مطلع کہتے ہیں تو ان کی زود گو طبیعت اسی رنگ میں دوسرے اشعار بے تکان موزوں کرنے لگتی ہے اور پھر اس دَریا کی روانی کسی اور خیال یا بندش کو خاطر میں نہیں لاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے غزل مکمل ہو جاتی ہے اور برقیؔ صاحب کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ زیرِ تصنیف غزل کے مضامین سے ملتے جلتے مضامین وہ اور بہت سی غزلوں میں باندھ چکے ہیں۔ زود گوئی اور بسیار گوئی کا ایک لاحقہ یہ بھی ہے کہ شاعر اپنے کلام پر نظر ثانی کے توسط سے خود احتسابی کرنے میں کمزور ہوتا ہے۔ غزل کہہ کر اس کی زود پسند طبیعت اُس کی اشاعت اور ابلاغ کو دوسری باتوں پر ترجیح دیتی ہے اور اس طرح یہ صورت حال غزل دَر غزل قائم رہتی ہے۔

زیرِ نظر کتاب کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ برقیؔ صاحب نے روایتی غزلیہ مضامین کے فقدان کا علاج دو طرح سے کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کی ہے۔ غزل مسلسل برقیؔ صاحب کے اس اقدام کا پہلا عنصر ہے۔ موصوف کی بیشتر غزلیں شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ اور تقریباً یکساں مضامین کے مختلف پہلو اجاگر کرتی ہیں گویا ان کی غزلوں میں مسلسل غزل کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ اس موضوع پر ان کے ساتھ گفتگو سے راقم الحروف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان کی غزل کا یہ رنگ غیر اختیاری ہے اور غزل کہتے وقت خود بخود مرتب ہوتا جاتا ہے یعنی وہ دانستہ غزل مسلسل نہیں کہنا چاہتے ہیں بلکہ ایسا غیر شعوری طور پر نادانستگی میں ہو جاتا ہے۔ یقیناً یہ صورت حال بھی ان کی زود گوئی کی وجہ سے ہے جس کا قدرے مفصل بیان آگے آئے گا۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے غزل شروع کرتے ہی ان کی زود گو طبیعت شعر گوئی کی باگ تھام لیتی ہے اور تقریباً بے اختیاری کے عالم میں غزل مکمل ہو جاتی ہے۔ ایسی غزل مسلسل کی دو مثالیں دیکھئے۔ یہ رنگ تغزل پوری کتاب میں نظر آتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مسلسل غزل کی یہ یکسانیت غزل کی اثر پذیری کم کرتی ہے اور اس پر اتنی شدت اور التزام سے عمل نہیں ہونا چاہئے تھا۔

مُجھ کو ہنس ہنس کر رُلایا دیر تک
چین پھر اُس کو نہ آیا دیر تک
آنے والا تھا حریمِ ناز میں
مُنتظر تھا میں نہ آیا دیر تک
تھا بہت صبر آزما یہ انتظار
بارِ ناز اُس کا اُٹھایا دیر تک
آتشِ سیال تھا میرا لہو
میرا خوں اُس نے جلایا دیر تک
میں ورق اُس کی کتابِ حُسن کا
چاہ کر بھی پڑھ نہ پایا دیر تک
ایک یادوں کا تسلسل تھا جسے
میں نہ ہرگز بھول پایا دیر تک
حالِ دل برقیؔ کا تھا ناگفتہ بہ
سر پہ چھت تھی اور نہ سایا دیر تک

غزل مسلسل کی ایک اور مثال درج ذیل ہے۔ایک ہی مضمون کے مختلف پہلو بیان کرنے میں برقیؔ صاحب کی مشاقی میں شبہ نہیں لیکن ایک حد کے بعد اچھی چیز کے حسن میں بھی کمی محسوس ہونے لگتی ہے۔

خانۂ دل میں تھے مہماں آپ تو ایسے نہ تھے
کردیا کیوں اِس کو ویراں آپ تو ایسے نہ تھے
آپ تو افسانۂ ہستی کا عنواں تھے مریدیکھ کر
اب ہیں گریزاں آپ تو ایسے نہ تھے

توڑ ڈالا زندگی بھر ساتھ دینے کا بھرم
کیا ہوئے وہ عہد و پیماں آپ تو ایسے نہ تھے
میرے دل میں کچھ نہیں ہے بھول جائیں آپ بھی
کس لئے ہیں اب پشیماں آپ تو ایسے نہ تھے
آپ کے لب پر ہے آخر آج کیوں مُہرِ سکوت
سازِ دل پر تھے غزلخواں آپ تو ایسے نہ تھے
کیف و سرمستی کا ساماں آپ تھے میرے لئے
مثلِ آئینہ ہیں حیراں آپ تو ایسے نہ تھے
کچھ بتائیں تو سہی اِس بدگمانی کا سبب
کیوں ہیں اب برقیؔ سے نالاں آپ تو ایسے نہ تھے

غزل کے روایتی موضوعات سے احتراز کے علاج کا دوسرا عنصر برقیؔ صاحب کی وہ کوشش ہے جو ہر مضمون، ہر بیان اور ہر جذبہ کو ایک شخص واحد کے حوالے سے پیش کرتی ہے۔ یہ شخص واحد خود برقیؔ صاحب ہیں۔ ان کی بیشتر غزلوں کا مرکزی کردار خود اُن کی ذات ہے۔ اگر یہ نکتہ ذہن میں رکھ کر اُن کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ان کی غزل انھیں کی شخصیت کے اِردگرد گھومتی ہے اور اس کا ظاہر و باطن انھیں کی ہستی ہے۔ کیا برقیؔ صاحب اپنی غزل کو اس کی روایت سے الگ کر کے ان کوششوں سے ایک نیا روپ یا آہنگ دے سکے ہیں؟ یہ مسئلہ غور و فکر کا طالب ہے۔ اس تناظر میں ''روحِ سخن'' کا مطالعہ دلچسپی سے یقیناً خالی نہیں ہے۔

برقیؔ صاحب کا رنگ تغزل ان کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں نکھر کر ظاہر ہوتا ہے۔ انہیں کم سے کم الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرنے کا ہنر بخوبی آتا ہے۔ چونکہ موصوف نے فارسی زبان میں ڈاکٹریٹ کی ہوئی ہے اس لئے انہیں فارسی پر عبور حاصل ہے اور وہ تراکیب کے استعمال سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھاتے بھی ہیں۔ فارسی کی استعداد سے وہ

مزید کام لے سکتے تھے لیکن ان کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں تراکیب کم ہی نظر آتی ہیں۔اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ برقی صاحب نے ایسی غزلوں میں خود کو آسان اور سامنے کے مضامین تک محدود رکھا ہے۔وہ ایسے مضامین کو باندھنے پر مجبور بھی ہیں کیونکہ غزل کے عام اور معروف مضامین سے تقریباً مکمل پرہیز نے ان پر مضامین کا میدان بہت تنگ کر دیا ہے۔غزل میں روایتی مضامین کا ایک عظیم ذخیرہ موجود ہے اور شاعروں کی بڑی اکثریت انہیں اپنے اپنے انداز میں باندھ کر اپنی غزل کے دامن میں وسعت پیدا کر لیتی ہے۔برقی صاحب کے یہاں مضامین کی یکسانیت نظر آتی ہے جو بعض اوقات قاری کی عدم توجہ اور عدم دلچسپی کا سبب بن جاتی ہے۔مضامین کی اس یکسانیت کے باوجود شاعر موصوف جا بجا اپنی شعر گوئی کی خداداد صلاحیت سے جذبات کا جادو جگاتے ہیں۔سیدھے سادے انداز میں گہری بات کہہ دینا اور آسان اور عام فہم الفاظ میں قاری کے دل کو چھو لینا آسان کام نہیں ہے۔برقی صاحب یہ ہنر خوب جانتے ہیں۔چھوٹی بحروں کے درج ذیل چند اشعار ان کی قادرالکلامی کی دلیل ہیں:

دل کی ویرانی کبھی دیکھی ہے کیا
یہ پریشانی کبھی دیکھی ہے کیا
میری چشم نم میں جو ہے موج زن
ایسی طغیانی کبھی دیکھی ہے کیا
آئینہ میں شکل اپنی دیکھ کر
ایسی حیرانی کبھی دیکھی ہے کیا

....

رسم الفت کو نبھا کر دیکھو
دل سے اب دل کو ملا کر دیکھو

جو تمہیں ہم سے الگ کرتی ہے
تم وہ دیوار گرا کر دیکھو
بوجھ ہو جائے گا دل کا ہلکا
خود ہنسو اور ہنسا کر دیکھو
بدگمانی کا نہیں کوئی علاج
ہم کو نزدیک سے آ کر دیکھو
میں نہ آؤں تو شکایت کرنا
پہلے تم مجھ کو بلا کر دیکھو
کیوں ہو برقیؔ سے خفا کچھ تو کہو
تم اسے اپنا بنا کر دیکھو

....

بہت رفتار تھی یوں تو ہوا کی
مری شمعِ وَفا پھر بھی جلا کی
میں جس سے کر سکوں عرض تمنا
ضرورت ہے اسی درد آشنا کی
ہے شیوہ جس کا برقیؔ بے وفائی
توقع اس سے کیا مہر و وَفا کی

....

دیدہ و دل ہیں فرشِ راہ مرے
تجھ کو بھی انتظار ہے کہ نہیں
مجھ سے باتیں اِدھر اُدھر کی نہ کر
یہ بتا مجھ سے پیار ہے کہ نہیں

منتظر کب سے ہے ترا برقیؔ
تجھ کو کچھ پاسِ یار ہے کہ نہیں

جہاں فطرت فیاض نے برقیؔ صاحب کو ذوق سلیم اور طبع موزوں سے متصف کیا ہے وہیں انہیں زود گوئی کی صلاحیت بھی عطا کی ہے۔ برقیؔ صاحب کی شعر گوئی بھی ان کے تخلص کی مناسبت سے برق رفتار ہے۔ وہ شعر اس قدر تیزی سے کہتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''فی البدیہہ مشاعروں'' میں اکثر شرکت کرتے ہیں اور سب سے پہلے غزل کہہ کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ برسوں کی مشق کے بعد اب ان کی زود گوئی کی یہ کیفیت ہے کہ برقیؔ صاحب کے یہاں وقت، موقع، تقریب، جشن، محفل کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ کوئی تقریب یا محفل ہو، کیسا ہی موقع یا جشن ہو وہ جب چاہیں، جس وقت چاہیں، جس قدر چاہیں اور جس موضوع پر چاہیں فی البدیہہ ایک شعر کے بعد دوسرا شعر بلکہ پوری پوری غزلیں یا طویل نظم کہنے پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ اب شعر گوئی ان کی عادت میں داخل ہو گئی ہے اور ان کے لئے شعر کہنا یا کوئی واقعہ یا حادثہ نظم کرنا نثر لکھنے کے مقابلہ میں بدرجہا آسان ہے۔ چنانچہ ان کے پاس ''موضوعاتی شاعری'' کا ایک ایسا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جو انہوں نے اپنے اردگرد کے حالات و واقعات کے انگیز کرنے پر کی ہے۔ اس شاعری میں سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی غرضیکہ ہر موضوع پر چھوٹی یا بڑی نظم یا قطعہ نہایت چابک دستی اور شستگی سے نظم کیا گیا ہے۔ ان کی اس موضوعاتی شاعری کا ایک حصہ زیر نظر کتاب ''روحِ سخن'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اتنے مختلف اور متنوع موضوعات پر یہ منظومات برقیؔ صاحب نے بلا تکان و تکلف کہی ہیں اور یہ ان کے فن کا کمال کی مکمل عکاسی کرتی ہیں۔ موضوعاتی شاعری نہ صرف یہ کہ آسان نہیں ہے بلکہ یک گونہ خطرناک بھی ہے کیونکہ ذرا سی لاپروائی یا تساہلی سے موضوعاتی شاعری رنگ بدل کر ''فضولیاتی شاعری'' بن سکتی ہے۔ برقیؔ صاحب جس طرح اس خطرے سے دامن بچا کر نکل گئے ہیں اس سے ان کی دقت نظر اور شاعرانہ مہارت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

یہاں زود گوئی کے حوالے سے چند باتیں کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ زود گوئی صرف ایک قسم کی نہیں ہوتی۔ ایک زود گوئی تو وہ ہوتی ہے جس کی وجہ سے غزل کے مضامین میں گہرائی اور گیرائی کم ہوجاتی ہے، اشعار میں زبان و بیان و مضامین کی یکسانیت دَرآتی ہے اور بعض اوقات کسی غزل پر یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ اس سے قبل نظر سے گزر چکی ہے۔ ایسی زود گوئی سے دامن بچانا مشکل ضرور ہے لیکن ایک ماہر اور صاحب فن شاعر کے لئے ناممکن نہیں ہے۔ برقیؔ صاحب کی یہ زود گوئی اختیاری ہے۔ وہ حسب فرمائش جب کہئے ہر موضوع پر دادِ سخن دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں۔ اُن کی زود گوئی ان کی غزل گوئی میں بھی دَر آئی ہے چنانچہ کئی زمینوں میں برقیؔ صاحب نے دوغزلے کہے ہیں۔ ویسے بھی ان کی عام غزل خاصی طویل ہوتی ہے۔ اختیاری زود گوئی میں ایک بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ بسا اوقات اس کے ساتھ بسیار گوئی کا لاحقہ بھی لگا ہوتا ہے گویا زود گوئی اور بسیار گوئی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو شاعر زود گو ہوگا وہ تقریباً ہمیشہ بسیار گو بھی ہوتا ہے۔ زود گو شاعر شعوری طور پر اگر بسیار گو نہ بھی ہو تو غیر شعوری طور پر اس کی زود گوئی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ شعر کے بعد شعر کہتا جائے گویا اس کی زود گو طبیعت شعر گوئی کا جو سوتا کھول دیتی ہے وہ فطری طور پر ایک دریا میں تبدیل ہوسکتا ہے اور شاعر اس میں بہنے کے لئے خود کو مجبور پاتا ہے۔ بذاتِ خود نہ تو زود گوئی میں کوئی برائی ہے اور نہ ہی بسیار گوئی کوئی عیب ہے۔ البتہ زود گوئی تو خطرناک نہیں ہوتی لیکن بسیار گوئی تقریبا ہمیشہ ہی خطرناک ہوتی ہے کیونکہ بسیار گو شاعر اپنی دُھن میں سامنے کے مضامین اور اچھے مضامین میں تمیز نہیں کرسکتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اس کی شاعری بھرتی کا شکار ہوکر رہ جاتی ہے۔

زود گوئی کی دوسری قسم غیر اختیاری ہے۔ اس کو علامہ اقبالؔ کی شعر گوئی کے حوالے سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ علامہ موصوف کی شعر گوئی کے بارے میں بانگِ دِرا کے دیباچہ نگار جناب شیخ عبدالقادر نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ ''(اقبالؔ) شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بے شمار اشعار ہو

جاتے تھے۔ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دُھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اس زمانے میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکرِ سخن کرتے نہیں دیکھا۔ موزوں الفاظ کا ایک دریا بہتا یا ایک چشمہ اُبلتا محسوس ہوتا تھا۔ ایک کیفیت رِقّت کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی، اپنے اشعار سُریلی آواز سے ترنم میں پڑھتے تھے، خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔'' آگے چل کر شیخ صاحب مزید لکھتے ہیں کہ ''بایں ہمہ موزونی طبع وہ (اقبالؔ) حسب فرمائش شعر کہنے سے قاصر ہے۔ جب طبیعت خود مائل بہ نظم ہو تو جتنے شعر چاہے کہہ دے، مگر یہ کہ ہر وقت اور ہر موقع پر حسب فرمائش وہ کچھ لکھ سکے یہ قریب قریب ناممکن ہے۔''

علامہ اقبالؔ کی زود گوئی غیر اختیاری تھی یعنی وہ ایک قسم کی کیفیت قلب تھی جو اُن پر کسی وقت طاری ہو جاتی تھی۔ان کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ جب چاہیں یہ کیفیت اپنے اوپر طاری کر لیں اور شعر کہنا شروع کر دیں۔ کسی دوست یا عزیز کی فرمائش پر غزل یا نظم کہنا اُن کے لئے تقریباً ناممکن تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہم غیر اختیاری زود گوئی کو آمد کہہ سکتے ہیں۔

یہاں کسی سطح پر بھی علامہ اقبالؔ اور برقیؔ صاحب کا تقابلہ مطلق مقصود نہیں ہے بلکہ زود گوئی کی مختلف قسموں کی نشاندہی اور شناخت دکھانا منظور ہے اور اس کوشش کا مقصد بھی برقیؔ صاحب کی غزل گوئی کے رموز و نکات کو واضح کرنا اور اُن پر دیانتداری سے اظہار خیال ہے۔ ادبی تنقید ایک صحت مند عمل ہے اور اس سے کسی کی تنقیص کبھی مقصود نہیں ہوتی۔ یہاں بھی یہی ادبی محرک کارفرما ہے۔

''روحِ سخن'' اپنی جملہ خوبیوں کی وجہ سے دنیائے اردو میں تحسین کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ نگاہ نکتہ چیں کو اس میں ایسے مقامات بھی نظر آئیں گے جن کی اصلاح کتاب کو بہتر بنا سکتی تھی لیکن یہ تو ہر انسانی کوشش کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس کیفیت کی ایک صورت کی جانب مختصر اشارہ کرنے میں ہرج نہیں ہے۔ شعر کو شاعر کی معنوی اولاد کہا جاتا ہے اور ہر شاعر کو اپنا کلام عزیز ہوتا ہے۔ اس کے لئے اپنے پورے کلام میں سے بہتر کلام کا انتخاب

کرنا کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتا کیونکہ اس کام میں ایک شعر کو دوسرے پر ترجیح دینی ضروری ہے۔ یہ کلیہ برقؔی صاحب پر بھی صادق آتا ہے۔ وہ بھی ''روح سخن'' کی ترتیب وترویج میں خود احتسابی کے صبر آزما مرحلے سے ہمیشہ کامیابی سے نہیں گزر سکے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ کتاب کی اشاعت کے لئے غزلوں کے انتخاب میں خود احتسابی کا سخت ترین معیار اختیار کرتے اور اس طرح اس کا معیار بلند کرتے۔لیکن وہ ہمیشہ ایسا نہ کر سکے ہیں چنانچہ دو چار مقامات پر ان کی غزلوں میں ایسے اشعار دَر آئے ہیں جو معیار کے لحاظ سے بہت کمزور ہیں۔اچھی خاصی غزل میں ایسے اشعار قاری کے لئے ایک لمحۂ فکر یہ بن جاتے ہیں۔چند مثالیں دیکھئے:

دیارِ شوق میں تنہا بلا کے چھوڑ دیا حسین خوابِ محبت دکھا کے چھوڑ دیا
کیا تھا وعدہ نبھانے کا رسم الفت کا دکھائی ایک جھلک مسکرا کے چھوڑ دیا
''رہا نہ گھر کا بالآخر نہ گھاٹ کا برقؔی'' وہ آزماتا رہا، آزما کے چھوڑ دیا

مقطع کے پہلے مصرع کے صحیح سیاق وسباق کو ذہن میں رکھا جائے تو اس کا جواز غزل میں نظر نہیں آسکتا۔زیادہ حدِ اَدب! اگلی مثالوں میں بھی قابل غور حصہ کو ''۔۔۔۔'' سے مقید کر دیا گیا ہے۔

دَرِ دل کھلا ہے چلے آیئے
یہ بے جا تکلف نہ فرمایئے
میں ہوں آپ کو دیکھ کر دم بخود
کہاں ہوں مجھے خود سے ملوایئے
''ضیافت کے ساماں ہیں سب آپ کے
جو جی چاہے وہ پیجئے کھایئے''

....

جلوہ گاہ خوباں میں جب کبھی وہ آتے ہیں
بارِ ناز سب ان کا شوق سے اٹھاتے ہیں
دل پہ اہل دل کے وہ بجلیاں گراتے ہیں
زیر لب ہمیشہ وہ جب بھی مسکراتے ہیں
''دو ہزار گیارہ تھا جیسے وعدۂ فردا''
سالِ نو میں بھی دیکھیں کیا وہ گل کھلاتے ہیں

برقیؔ صاحب کے یہاں اچھے اشعار کی کمی نہیں ہے۔ان سے موصوف کی شاعری کا حسن مزید بڑھ گیا ہے۔اگر وہ اپنے کلام کے حق میں جذباتیت سے کام نہ لیتے تو اس حسن و قیمت میں اور بھی اضافہ ہوتا۔بایں ہمہ برقیؔ صاحب کی شاعری ایک حساس صاحب دل اور ماہر فن کی شاعری ہے۔اُردو شاعری میں برقیؔ صاحب نے اب تک جو مقام حاصل کیا ہے مستقبل میں اس میں ترقی یقینی ہے۔اس ضمن میں ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔درج ذیل اشعار موصوف کی مہارت سخن اور صلابت فکر کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں:

نہ تو ملتا ہے وہ مجھ سے،نہ جدا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا ہوتا ہے
جب نہیں دیتا دَرِ دل پہ وہ دستک برقیؔ
کیا بتاؤں میں تمھیں ایسے میں کیا ہوتا ہے
جاتا ہے مجھ کو چھوڑ کے اے بے خبر کہاں
''تیرے بغیر رونقِ دیوار و دَر کہاں''
پھر وہی شدتِ جذبات کہاں سے لاؤں
جیسے پہلے تھے وہ حالات کہاں سے لاؤں
منتشر ہو گئے اَوراقِ کتابِ ہستی
ساتھ دیتے نہیں حالات کہاں سے لاؤں

داستاں ایسی ہے جس کا نہیں عنواں کوئی
مجھ سا دُنیا میں نہیں بے سرو ساماں کوئی
سوچتا ہوں کچھ کہوں، پھر سوچتا ہوں کیا کہوں
اپنے آگے وہ کسی کی مانتا کچھ بھی نہیں

''روحِ سخن'' اُردو غزلیہ شاعری میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ برقیؔ صاحب کی شاعری غزل میں نئے تجربوں کی طرف اچھی پیش قدمی ہے۔ ان کا اگلا قدم شاید اس شعور معرفت کی اگلی منزل کی طرف بڑھے گا جس کا انھوں نے اپنے اس خوبصورت شعر میں اشارہ کیا ہے۔ برقیؔ صاحب کی یہی موعودہ خود شناسی اردو شاعری میں ان کے مقام کی ضامن ہوگی۔

شعورِ معرفت مضمر ہے برقیؔ خود شناسی میں
''خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا''

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، انڈیا

اک یادوں کی بارات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی
اب شدتِ جذبات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

میرے دلِ صد پارہ کے ٹکڑے ہیں ہر اک سمت
تقسیم کی سوغات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

کیوں امن کے دشمن ہیں بہم دست و گریباں
دہشت کی خرافات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

آسودہ نہیں کوئی بھی حالات سے اپنے
کہنے کو مساوات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

نفرت کی یہ دیوار گرا کیوں نہیں دیتے
جو وجہِ فسادات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

اب جذبۂ ایثار و محبت ہے ضروری
خمیازۂ شبہات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

یہ ترکِ تعلق کا نتیجہ ہے کہ جس سے
اب شوقِ ملاقات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

ہے رات ابھی آئے گی کب صبحِ بہاراں
ہر دل میں یہی بات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

جھگڑا ہے کہیں رنگ کہیں نسل کا برقیؔ
اک یورشِ آفات اِدھر بھی ہے اُدھر بھی

ڈاکٹر پرویز شہریار، انڈیا

شموئل احمد کی افسانہ نگاری

شموئل احمد کی پہچان اُن کے مشہور افسانہ ''سنگھاردان'' سے قائم ہوتی ہے، لیکن خود شموئل احمد کو ''عنکبوت'' میں شامل افسانہ ''ظہار'' بہت پسند ہے۔ چنانچہ 'ظہار' اگر شموئل کا سب سے پسندیدہ افسانہ ہے تو 'سنگھاردان' کی بھی اپنی انفرادی شان ہے۔

شموئل احمد نے 'سنگھاردان' میں جس طرح ہندوستانی مسلمانوں کی اجتماعی سائیکی پر سوار فسادات کے مضر اثرات کے آسیب کو بوتل میں قید کیا ہے۔اس کمالِ فن تک مابعد جدیدیت کے اچھے سے اچھے افسانہ نگار کی رسائی ممکن نہیں ہو پائی ہے۔اعتراض کرنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ آٹھویں دہائی کے بعد افسانہ نگاری کے نام پر زیادہ تر رپورٹنگ ہوئی ہے۔ایسے ناقدین ادب سے میری مودبانہ گزارش ہے کہ وہ ایسے قلب کو بے چین کر دینے والے احساسات اور روح کو فگار کر دینے والے کٹیلے واقعات پر مبنی شموئل کے افسانے کی قرات سے خود کو کم از کم ایک بار ضرور گزاریں اور دیکھیں کہ اس افسانے میں موجود آتشیں شعلوں سے وہ کس حد تک اپنا دامن بچا پاتے ہیں۔المختصر، یہ افسانہ شموئل احمد کا معجزۂ فن ٹھہرا ہے۔

شموئل نے ایسے ایسے موضوعات پر افسانے لکھے ہیں جن پر میں سمجھتا ہوں کوئی بھی میڈیا خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا رپورٹنگ نہیں کر سکتا ہے۔ادب اگر تہذیبی دستاویز ہے تو شموئل کے افسانے اپنی تمام تر جمالیاتی قدروں کے ساتھ فنکارانہ تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے اسلوب کی انفرادیت کے ساتھ ادبی دستاویز قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

فسادات میں کشت وخون، آتش زنی اور لوٹ مار عام بات سمجھی جاتی ہے۔جس کا نوحہ قریب قریب سبھی افسانہ نگاروں نے لکھا ہے۔جان اور مال کے زیاں کا حساب بہتوں نے پیش کیا ہے۔دل و دماغ کے زخمی ہونے اور فوری ردّعمل کی صورت میں نفسیاتی طور پر

اعضائے رئیسہ کے مفلوج ہونے کے واقعات بھی قلم بند کیے گئے ہیں۔لیکن سنگھاردان کے کلیدی کردار برجموہن اوراس کی تین جوان بیٹیوں اور بیوی کا قلب ماہیئت ہو جانا اوراپنے تمام ہوش وحواس کے ساتھ رنڈیوں اور دلال میں تبدیل ہو جانا، اپنے آپ میں ایک ایسا عجیب وغریب واقعہ ہے جوکہیں نہ کہیں ہندوستانی مسلمانوں کی متاثرہ سائیکی کو چھو جاتا ہے۔یہی اس افسانے کے موضوع اوراس کے ٹریٹ منٹ کی غیر معمولی کامیابی کا راز ہے۔

اسی طرح،ان کا افسانہ ''ظہار'' بظاہر ایک مذہبی معاشرت سے تعلق رکھنے والا افسانہ ہے۔لیکن جس طرح سے شموئل نے اس موضوع کو افسانہ کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ کہانی کے ہیرو پراس کی بیوی نجمہ حرام ہوگئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اس نے خلوت میں جنسی عمل کے پس منظر میں بیوی کو ماں سے تشبیہ دے دی تھی۔ایسا کر کے وہ ظہار جیسے گناہ کا مرتکب ہوگیا تھا اوراس کے بعد وہ کفارہ ادا کیے بغیر بیوی سے جنسی تعلقات کے لیے رجوع نہیں کرسکتا تھا۔

شہر قاضی نے اس کے لیے مشورہ دیا تھا کہ -------

''شوہر کو چاہیے کہ ایک غلام آزاد کرے یا دو ماہ مسلسل روزہ رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلائے۔''

نجمہ کے دو سال بعد بھی جب بچہ تولید نہ ہوا تو ساس نے مشورہ دیا کہ وہ چربیا گئی ہے۔اس لئے بچہ نہیں جن سکتی ہے۔ نجمہ کے شوہر کو لگتا ہے کہ ماں اس کی دوسری شادی نہ کردے کیونکہ وہ نجمہ سے بے انتہا پیار کرتا ہے۔ حالات کے دباؤ میں وہ غیر فطری جنسی پیش رفت کر بیٹھتا ہے۔ نجمہ ایک موذن کی بیٹی ، مذہبی خیالات کی لڑکی تھی۔ وہ اسے گناہ سمجھتی ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کفارہ کے طور پر کہانی کا ہیرو جو کہ پیشے کے اعتبار سے کاتب ہے، وہ مجاہدہ کی ٹھان لیتا ہے۔ وہ دو ماہ تک مسلسل روزے رکھتا ہے۔اس کے بعد نجمہ کی صحبت میں جب اسے جنسی حاجت محسوس ہوتی ہے تو وہ وضو بنا کر نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے اور خود پر لعنت بھیجتا ہے:

''تف ہے مجھ پر کہ پیشاب دان سے پیشاب دان کا سفر کروں......''

اس کہانی کا اصل موضوع ملکوتی خواہشات کے ذریعے جبلی خواہشات پر قابو پانا ہے۔ بے شک یہ عارضی کیفیت ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عورت اور مرد کے فطری خواہشات کے ابلتے ہوس چشمے کو سنگ ملکوتیت سے دبایا جا سکتا ہے۔ اخلاقی اور مذہبی اصول وضوابط کے تحت قابو میں کیا جا سکتا ہے؟

شموئل کا اپنا اسلوب بیان اس افسانے میں بھی جلوہ افروز ہے۔ وہ عورت اور مرد کی خلوت کی جزیات اپنے انداز سے بیان کرتے ہیں۔ جب کہانی کا ہیرو اپنی غیر فطری پیش رفت پر تاسف کر رہا ہوتا ہے تو اس کی جزئیات دیکھئے:

''نجمہ اسی طرح سوتی تھی......وہ اس کے لب و رخسار کو چومتا تھا۔ آخر کیا کمبختی سوجھی کہ کولھے لبھانے لگے اور اس نے لواطت کو راہ دی......؟ اس پر شیطان غالب ہوا۔ اس کو حیرت ہوئی کہ کس طرح وہ اپنا ہوش کھو بیٹھا تھا......؟ اس نے نجمہ کے ساتھ زیادتی کی......وہ ڈر گئی تھی۔ ہر عورت ڈر جائے گی......نجمہ تو پھر بھی معصوم ہے۔ نیک اور پاک صاف بی بی......جیسے خدا نے ایک ناہنجار کی جھولی میں ڈال دیا۔''

اس افسانے میں نفس امارہ کی کرشمہ زائیوں سے لڑنے کے لیے گرسنگی کو ہتھیار بتایا گیا ہے۔ گناہوں سے توبہ، معافی، عبادت، روزہ، اپنے نفس سے مجاہدہ، دنیاوی لذتوں سے اجتناب کے ذریعے خباثت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ یہ سبھی اعمال سچے دل سے کیے جائیں۔

''اس کو پہلی بار احساس ہوا کہ عبادت کا بھی اپنا سرور ہے۔ واپسی میں قاضی سے ملاقات ہوئی۔ قاضی اس کو دیکھ کر مسکرایا۔ ''مسجد نہیں آتے ہو میاں......؟''

جواب میں وہ بھی مسکرایا۔

''جہنم کی ایک وادی ہے جس سے خود جہنم سو بار پناہ مانگتی ہے اور اس میں وہ علما داخل ہوں گے جن کے اعمال دکھاوے کے ہیں۔''

'مصر کی ڈلی'' بھی نو بیاہتا جوڑے راشدہ اور عثمان کی ازدواجی زندگی سے جنسی کشش اور مدافعت کی کہانی ہے۔ ایسے باریک احساس کی کہانی ہے جہاں ایک شریف نوجوان عثمان اپنی بیوی راشدہ کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے اور اسے اس کی خوشی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے درپے رہتا ہے لیکن اس کے جنسی رویوں میں عورت کو تہہ و بالا کر دینے والی وہ قوت نہیں ہے، اس کی بیوی راشدہ جس کی متمنی ہے۔ راشدہ جنسی اعتبار سے گرم اور پہل کرنے والی جوان عورت ہے۔ تاہم راشد کی طرف سے وہ والہانہ پن کی کمی اسے اپنے گھر کے سامنے آئے نئے پڑوسی الطاف کی طرف ملتفت کر دیتی ہے۔ یہ دو اقتباس دیکھیں:

''عثمان کے ہاتھ کھردرے ہوں گے، لیکن اس کی گرفت بہت نرم تھی......وہ بھنبھوڑتا نہیں تھا......وہ راشدہ کو اس طرح چھوتا جیسے کوئی اندھیرے میں بستر ٹٹولتا ہے......!''

''جنسی فعل کے دوران کوئی شیشہ دیکھے گا تو کیا دیکھے گا......؟ جبلت، اپنی خباثت کے ساتھ موجود ہوگی۔ لیکن عثمان کے ساتھ ایسا نہیں تھا...... وہ اس کے لب و رخسار کو اس طرح سہلاتا جیسے عورتیں رومال سے چہرے کا پاؤڈر پونچھتی ہیں!''

عثمان کا نیا پڑوسی الطاف کسی نہ کسی بہانے سے ان کی ازدواجی زندگی میں آڑے آتا ہے اور عثمان کے دل و دماغ میں شبہ جڑ پکڑنے لگتی ہے۔ اس افسانے کے کردار اور واقعات کو شموئل نے ستاروں کی خصلت کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ عثمان کا ستارہ منگل ہے لیکن الطاف شنی ہے۔ شنی چمر چٹ ہے، وہ پیچھا نہیں چھوڑتا۔ شنی دکھ کا استعارہ ہوتا ہے اور منگل خطرے کی علامت ہے۔ کہتے ہیں کہ شنی اور منگل کا جوگ اچھا نہیں ہوتا۔ چوتھے خانے میں

ہوتو گھر برباد کردے گا اور دسویں خانے میں ہوتو دھندہ چوپٹ کرے گا۔

راشدہ بہت پیار دینے والی عورت تھی۔اس لیے عثمان کو الطاف سے زیادہ اپنی بیوی راشدہ سے خطرہ محسوس ہونے لگتا ہے۔جب بھی عثمان،الطاف کی چوری پکڑ لیتا ہے راشدہ اس کا بیچ بچاؤ کرنے لگتی ہے۔

الطاف،راشدہ کے شوہر عثمان کی غیر موجودگی میں موقع دیکھ کر راشدہ کی قربت حاصل کر لیتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ وہ دونوں کھل کھیلنے لگتے ہیں۔الطاف کی نوازشیں جاری رہتی ہیں۔کبھی مچھلی،کبھی باسمتی چاول کی کبھی،تیل مصالحہ،کبھی سبزیاں،مٹھائی کے ڈبے وغیرہ وہ تحفے تحائف کے طور پر دے جاتا ہے۔

شنی کی ایک خوبی اور بھی ہے شنی جس کا دوست ہو جائے،اسے اپنی نوازشوں سے لاد دیتا ہے۔شموئل نے اس پہلو کو'مصری کی ڈلی'میں عملاً ہوتا ہوا دکھایا ہے۔

آخر میں عثمان اس مداخلت بے جا کا اس قدر عادی ہو جاتا ہے کہ وہ ایک طرح سے اپنی ازدواجی زندگی کے تحفظ کے لئے سمجھوتا کر لیتا ہے۔

''راشدہ آہستہ سے عثمان کے کانوں میں پھسپھسائی۔''اجی جب تک الطاف بھائی دوسرے کمرے میں آرام کر لیں تو کوئی حرج ہے؟''

عثمان اس وقت مچھلی کھا رہا تھا۔اس کو لگا کانٹا حلق میں پھنس رہا ہے......

عثمان نے سادہ چاول کا نوالہ بنایا اور چاول کے ساتھ کانٹا بھی نکل گیا۔''

شموئل احمد نے اپنے افسانے''سراب''میں سماجیاتی تناقصات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ترقی یافتہ مسلم معاشرہ اور دقیانوسی یا Ghatto مسلم معاشرے کے تفاوت کو بہت ہی موثر اور دلچسپ ڈھنگ سے اپنے منفرد اسلوب کے ساتھ پیش کیا۔

اس میں دکھایا گیا ہے کہ کیسے اسکول کے ایک ماسٹر خلیل کا اطاعت گزار بیٹا بدرالدین جیلانی آئی اے ایس آفیسر ہو جاتا ہے اور باپ کی انا اسے کامیابی کی منتہا پر دیکھنا چاہتی ہے۔اس چکر میں جیلانی کی شادی کسی کمشنر رحیم صمدانی کی بیٹی سے کرا دی جاتی ہے۔لیکن میڈم

جیلانی کی پرورش اونچی سوسائٹی میں ہوئی ہے۔اس لیے مسلم گھیٹو ائزڈ محلے میں وہ رہنا پسند نہیں کرتی ہے۔یہ لوگ آئی اے ایس کالونی میں آباد ہوجاتے ہیں۔شہر کی پرتکلف زندگی کبھی جیلانی کوراس نہیں آتی اور تمام عمر وہ پلٹ کر اپنے محلے اور اپنے بچپن کے دوست حیات اور معشوقہ حسن بانو کی طرف حسرت بھری یادوں کے ساتھ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

حتیٰ کہ عمر کے آخری پڑاؤ میں جب لیڈی عاطفہ حسین کی موت ہوجاتی ہے۔تب پہلی فرصت میں جیلانی اپنے آبائی محلّہ میں واپس آتا ہے، جہاں اس کے بچپن اور جوانی کے شب وروز گزرتے تھے۔لیکن تب تک بہت کچھ بدل چکا تھا۔محلّہ شہر نما ہوگیا تھا۔حتیٰ کہ اس کی استانی کی بیٹی حسن بانو سے اس کی اتفاقیہ ملاقات ہوجاتی ہے۔جس کے بالوں میں عمر رسیدگی کی وجہ سے چاندنی گھل چکی ہوتی ہے۔دونوں ایک دوسرے کوحسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔جیلانی کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔دوسرے دن وہ شہر چلا آتا ہے۔لیکن شہر آتے ہی اس کے بچپن کے دوست حیات کا فون آتا ہے کہ حسن بانو اب اس جہاں میں نہیں رہی۔جیسے وہ جیلانی کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہی اب تک زندہ تھی اور دیدار کے بعد اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرجاتی ہے۔

اس درد بھری کہانی میں شموئل کے فن نے دل کو چھولیا ہے۔ہر چند کے شموئل کا فن موڈرن آرٹ کی طرح بہت تفصیل بیان نہیں کرتا ہے پھر بھی ان کے موئے قلم کی جنبش سے جو چند آڑی ترچھی لکیریں کھینچی ہیں ان میں انھوں نے درد انڈیل دیا ہے۔مسلم معاشرے کی خامیوں کواجاگر کیا ہے۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس میں وحدت تاثر اپنی جگہ موجود ہے۔لیکن وہ واقعات کے بیان میں بیدی کی طرح چول سے چول نہیں کستے بلکہ منٹو کی طرح لفظوں کا بڑی کفایت شعاری سے استعمال کرتے ہیں۔اختصار ہی ان کے افسانوں کا امتیازی وصف ہے۔البتہ بیان میں راوی کہیں نمایاں نہیں ہوتا بلکہ پس پردہ واقعات بیان کرتا جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں حکایت کی طرح پند ونصیحت کی سطریں بھی آجاتی ہیں جس سے قصے کی تفہیم اور

رفتار میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا ہے، مثلاً:

''انسانی رشتوں میں انا کی کیل جڑی ہوتی ہے۔سب میں بھاری ہوتی ہے
باپ کی انا......!
باپ کا رول اکثر ویلن کا بھی ہوتا ہے۔''

مذہبی ریا کاری، جنس اور جرائم کے موضوعات پر بے شمار افسانے لکھے گئے ہیں لیکن شموئل احمد کا افسانہ 'اونٹ' اب تک لکھے گئے تمام افسانوں سے ان معنوں میں مختلف ہے کہ شموئل نے یہاں منفی قدروں کی حامل سکینہ کے اندر موجود مثبت قدروں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔انسان اور سکہ میں فرق ہوتا ہے۔کھوٹا سکہ دونوں طرف سے کھوٹا ہوتا ہے لیکن انسان کا اگر ایک پہلو برا ہے تو دوسرا پہلو بھی برا ہو کوئی ضروری نہیں ہے بلکہ بعض اوقات دوسرا پہلو اچھا بھی ہوسکتا ہے۔اس کہانی کی مرکزی کردار سکینہ کا حال کچھ ایسا ہی ہے۔وہ ایک حرافہ اور فاحشہ عورت ہے جس کے شوہر کا کوئی پتہ نہیں اور وہ اپنے دو بچوں سمیت رحمت علی کے جواری بیٹے حشمت علی کے گلے پڑ جاتی ہے۔محلے والے اسے حشمت علی کی رکھیل بتلاتے ہیں۔

مذہبی ریا کاری کے نمائندہ کردار مولانا برکت اللہ وارثی ہیں جو کسی مسجد کے امام ہیں دوسری طرف توہم پرستی اور اندھی عقیدت کے شکار رحمت علی کا کردار ہے جن کا خیال ہے کہ ان کے گھر پر کسی نے سحر کر دیا ہے جس سے ان کے گھر کی برکت جاتی رہی ہے اور اکلوتا بیٹا جواری نکل گیا ہے جو کہیں سے دو بچوں کی ماں سکینہ کو اٹھالاتا ہے۔مولانا برکت اللہ کی آمد ورفت دعا تعویذ کے بہانے گھر تک شروع ہوجاتی ہے اور سکینہ سے ان کے جنسی تعلقات قائم ہوجاتے ہیں۔لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سکینہ کے اندر موجود مذہبی امور کے تئیں مثبت قدریں کروٹیں بدلنے لگتی ہیں اور وہ مولانا کے ساتھ اس کے ناجائز رشتے پر انگلی اٹھانا شروع کر دیتی ہے۔جس کا انجام اسے اپنی موت کو گلے لگا کر بھگتنا پڑتا ہے۔

افسانے کے ابتدائی چند جملوں میں شموئل نے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ افسانہ سانحات

(Events) کا افسانہ ہے، جہاں ایک عجیب وغریب صورت حال نے جنم لیا ہے اور اس کے کردار مذہب، جنس اور احساس جرم کی دلدل میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''مولانا برکت اللہ وارثی کا اونٹ سرکش تھا اور سکینہ رسی بانٹی تھی۔ مولانا نادم نہیں تھے کہ ایک نامحرم سے ان کا رشتہ اونٹ اور رسی کا ہے، لیکن وہ مسجد کے امام بھی تھے اور یہ بات ان کو اکثر احساس گناہ میں مبتلا کرتی تھی۔''

سگمنڈ فرائڈ نے جنس کی جبلت کو حیات انسانی کے بدلاؤ کا سب سے بڑا محرک بتایا ہے۔ یہاں مولانا برکت اللہ وارثی جیسا عالم جسے نفس پر قابو اور ضبط کرنے کی تعلیم و تربیت حاصل ہے، وہ بھی اس کی بھوک سے تڑپ اٹھتا ہے اور اپنی بیوی کی بہ نسبت ایک فاحشہ کے اندر زیادہ شہوانی کشش محسوس کرتا ہے اور اس پر اپنی جان چھڑکنے لگتا ہے۔ اس کی ناز برداری کرتا ہے اور اس کی ہر فرمائش پوری کرتا ہے تو اس کے پیچھے بھی یہی جنسی جذبہ کارفرما ہوتا ہے:

' (مولانا نے) زندگی میں کبھی نتھ نہیں خریدی تھی......وہ بھی سونے کی ......زوجہ نتھ نہیں پہنتی تھی، وہ بلاق پہنتی تھی ناک کے بیچوں بیچ چاندی کی بلاق...... وہ خانقاہی تھی۔ بستر پر آتی تو دعائے مسنون پڑھتی اور مولانا نے محسوس کیا تھا کہ سکینہ میں جست ہے اور زوجہ ٹھس ہے۔''

لیکن فرمائشوں نے جب تحکمانہ انداز اختیار کرلیا تو مولانا کو سر سے پانی اوپر ہوتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ آخر ایک دن واقعہ یہ ہوا کہ مولانا نماز جنازہ پڑھا کر اپنے گھر جانے کے بجائے سکینہ سے جنسی لگاوٹ کی خواہش لیے سیدھے سکینہ کے گھر پہنچتے ہیں۔ لیکن عین وقت پر سکینہ کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اور وہ مولانا سے امامت سے استعفیٰ دینے کی ضد پکڑ لیتی ہے۔ سکینہ کہتی ہے میں تو بری ہوں، لوگ مجھے برا سمجھتے ہیں لیکن آپ امام ہیں۔ قوم آپ کے پیچھے نماز پڑھتی ہے۔ آپ کو بحیثیت امام یہ سب حرکتیں زیب نہیں دیتی ہیں۔ اس پر مولانا ایک فاحشہ کی تنبیہ برداشت نہیں کر پاتے ہیں۔ وہ ایک دم چراغ پا ہو جاتے ہیں۔ مولانا یکلخت کو محسوس ہوتا ہے گویا سکینہ بھی زوجہ کی طرح ٹھس ہے۔ سکینہ کہتی ہے:

''بھلا آپ جیسا آدمی جنازے کی نماز پڑھائے......؟

''قوم ہر جگہ رسوا ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ آپ جیسے لوگ امامت کر رہے ہیں۔زندگی میں اگر صحیح نماز نہیں ملی تو کم از کم مرنے کے بعد تو نصیب ہو......''

رفتہ رفتہ مولانا برکت اللہ اس فاحشہ عورت سے نظر چرانے لگتے ہیں۔وہ ہر وقت ان سے امامت سے استعفیٰ دینے کی نصیحتیں کرتی رہتی ہے۔لیکن جب سکینہ انکشاف کرتی ہے کہ وہ پیٹ سے ہے اور بیٹا ہوا تو دیوبند میں پڑھائے گی اور عالم فاضل بنائے گی۔تو یہ سنتے ہی مولانا کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ سکینہ ضدی ہے۔اگر وہ کہہ رہی ہے تو بیٹے کا نام بھی قدرت اللہ وارثی ضرور رکھے گی۔

وہ اس فاحشہ کے بطن میں پلنے والے امام کے وجود کے تصور سے کانپ جاتے ہیں۔مولانا کو محسوس ہوتا ہے کہ سکینہ کی خم دار پشت دراصل جارحیت کی غماز ہے......آگے کی طرف نکلا ہوا سینہ......تلوار کی طرح لہراتے ہوئے بازو،عقاب جیسی آنکھیں......ایسی عورتیں آسانی سے سپر نہیں ڈالتیں ہیں۔مولانا کو اس وقت لوک لاج ستانے لگتا ہے اور شہوت کا بھوت سر سے غائب ہو جاتا ہے۔

''مولانا کو خاموش دیکھ کر سکینہ کی آنکھوں میں نفرت کی چمک بڑھ گئی۔''

''ایمان کی حفاظت ضروری ہے۔''پھر اس نے سر سے پاؤں تک آگ برساتی نظروں سے دیکھا اور انتہائی حقارت سے بولی۔

''آپ جیسا امام......؟ اونہہ......!''اور کمرے سے نکل گئی......کمرے سے نکلتے ہوئے اس نے فرش پر تھوکا نہیں تھا لیکن مولانا کو لگا کہ حرامن نے باہر نکل کر تھوکا ہے......حرام زادی چھنال......!!''

مولانا برکت اللہ اپنی ہتک برداشت نہیں کر پاتے ہیں۔جیسے ہی سفلی جذبہ شہوت کا عمل دخل کمزور پڑتا ہے۔اسی وقت بدلہ اور انتقام جیسے سفلی جذبے اس خلا کو پر کر دیتے ہیں۔انسان کے اندر موجود ہوس کی آگ اب انتقام کی آگ میں بدل جاتی ہے۔تبھی وہ اس راز کو

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دفن کر دینے کا منصوبہ بنا لیتے ہیں اور موقع ملتے ہی وصال کے لمحات میں تکیہ سے منھ دبا کر اسے ہمیشہ کے لئے کی موت کی نیند سلا دیتے ہیں۔

''سکینہ کی آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی......آنکھیں اُبل پڑیں......زبان اینٹھ گئی ناک اور منھ سے خون ابل کر تکیے پر پھیل گیا۔''

شموئل احمد کا 'اونٹ' معاشر کے دوہرے معیار زندگی اور Doxa کے تحت اپنی سماجی حیثیت منوانے والے مرد اساس معاشرے پر ایک زبردست طنز ہے جس میں تلخی اور ترشی دونوں گھلی ہوئی ہے۔شموئل نے سماجی حاشیہ پر زندگی بسر کرنے والی ایک حرافہ اور فاحشہ عورت کے ذریعے سماج کے مقتدر علما کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے شخص پر طنز کے بھرپور تازیانے لگائے ہیں۔ایسے افراد معاشرے اور ملت کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور موقع بے موقع اپنی سفلی خواہشوں کی غلام گردش سے بھی باز نہیں آتے ہیں۔ایسی صورت حال، سماج میں ناسور اور کینسر کی طرح پنپ رہی ہے اور اس کا اگر وقت رہتے سد باب نہیں کیا گیا تو عین ممکن ہے کہ ایک دن پورا معاشرہ اس کی چپیٹ میں آجائے گا۔

شموئل کو علم نجوم سے بھی گہرا شغف رہا ہے۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ 'مصری کی ڈلی' کے علاوہ انھوں نے دیگر کئی ایسے افسانے لکھے ہیں مثلاً 'القموس کی گردن' اور 'چھگما' جن میں کھل کر علم نجوم کی اصطلاحوں کا فنکارانہ اور تخلیقی استعمال کیا گیا ہے۔

شموئل کے بارے میں اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کی نظر ہمیشہ جنس کی نفسیات پر رہتی ہے۔لیکن معروضی نظر سے دیکھا جائے تو شموئل احمد روایت کی پاسداری کے ساتھ ساتھ پختہ عصری حسیت کے بھی مالک ہیں۔موضوعات کی ندرت اور بوقلمونی نے ان کے افسانوں کو ایک علیحدہ تشخص عطا کی ہے۔ان کے اکثر افسانے پیچیدہ سیاسی بصیرت اور عمیق عمرانی شعور سے بھی معمور معلوم ہوتے ہیں۔ان کے منفرد اسلوب اور دلکش انداز بیان کی ہی کرشمہ زائیاں ہیں کہ ان کے افسانوں کو عصری اردو ادب میں ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر فخر الاسلام، پشاور

ٹرین کہانی

جب سے ہوش سنبھالا میرا اور ٹرین کا چولی دامن کا ساتھ رہا۔غمی شادی پر والدہ کے ساتھ،ٹرین پر سفر کرتا رہتا تھ میرا تعلق درگئی ملاکنڈ سے ہے، ریلوے نظام کا شمال کی طرف آخری سٹیشن درگئی تھا۔ ہمارے مردان اور نوشہرہ میں رشتہ دار تھے جن کے ہاں کسی بھی بہانے جانا ہوتا تو درگئی سے ٹرین پکڑ لیتے تھے۔والدہ صاحبہ ہر سال زیارت کا کا صاحب بھی جاتی تھی، وہ سفر بھی ٹرین سے ہوتا تھا۔ پھر لڑکپن میں رشتہ دار لڑکوں کے ساتھ ٹرین کا سفر موج مستی سمجھ کر کرتا تھا۔فرق یہ تھا کہ والدہ باقاعدہ ٹکٹ لیتی تھی اور ہم بغیر ٹکٹ کے سفر کرتے تھے۔بغیر ٹکٹ کے سفر جرم تھا اور خطرے سے خالی بھی نہیں تھا لیکن ہم عمر کے اُس حصے میں تھے کہ ان دونوں چیزوں کا نہ شعور تھا اور نہ احساس۔ چنانچہ ریلوے کا ٹکٹ چیک کرنے والا افسر جس کو ٹی ٹی کہتے تھے (پتہ نہیں یہ کن الفاظ کا مخفف تا ی؟ ہماری بوگی میں آتا تھا تو ہم چلتی گاڑی میں دوسری بوگی بھاگتے تھے۔دو بوگیوں کے پائیدانوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوتا تھا کہ ٹانگ کو زور سے پھیلا کر دوسرے پائیدان پر چڑھتے تھے یہ بہت خطر ناک عمل تھا جس کے دوران کئی لوگ زخمی بھی ہوئے تھے۔میرے رشتے کے ماموں زاد محمد ستار اسی عملِ بد کے دوران ٹرین سے گرا تھا،اس کی ایک ٹانگ ٹرین کے پہیئے کے نیچے آ کر جسم سے الگ ہوئی تھی۔

درگئی۔نوشہرہ روٹ پر ٹرین بھاپ کے انجن سے چلتی تھی۔ بھاپ انجن سے لگی ایک ٹنکی کینیچے کوئلہ جلا کر پید کی جاتی تھی۔ درگئی ریلوے سٹیشن پر کوئلے کے بڑے بڑے ڈھیر ہوتے تھے ان ڈھیروں سے ریلوے کے مزدور بیلچوں کے ذریعے کوئلہ انجن کے مخصوص حصے میں ڈالتے تھے۔اس کے آگے ایک بڑے پائپ سے ٹنکی میں پانی بھی ڈالا جاتا تھا۔نوشہرہ

سے آنے والی ٹرین کا رخ شمال کی طرف ہوتا تھالھذا واپسی پر انجن کا رُخ جنوب کی طرف عجیب طریقے سے موڑ دیا جاتا تھا۔ سٹیشن کے ایک کونے میں 6 یا 7 فٹ کا کنواں ہوتا تھا جس کے بیچ میں پٹڑی ہوتی تھی، یہ پٹڑی کنویں کے نیچے گول پہیئے پر گھومتی تھی چنانچہ انجن کو اس پر کھڑا کر کے پٹڑی کے دونوں سروں پر لگے ھینڈلوں کو دھکا دیا جاتا تھا جس سے انجن کا رخ مخالف سمت کی طرف مڑتا تھا۔ ریلوے کے لوگ اس عمل کے دوران عام لوگوں کی شرکت کا برا نہیں مناتے تھے چنانچہ ہم حسب توفیق قومی اہمیت کے اس کارخیر میں حصہ ڈالنے کے لئے بروقت کنویں کے کنارے پہنچ جاتے تھے۔

سٹیشن میں داخل ہونے، پلیٹ فارم پر رکنے اور واپس روانگی تک ٹرین اپنے ساتھ زندگی کی گھما گہمی اور جوش لاتی تھی۔ یہ ماحول گھنٹہ بھر جاری رہنے کے بعد ٹرین کی واپسی پر خاموشی میں بدل جاتا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر ٹرینوں کے ڈرائیوروں کی رہنمائی اور پٹریوں پر مختلف ٹرینیں چڑھانے کا الگ نظام ہوتا تھا۔ یہ نظام اگرچہ اب فرسودہ ہو چکا ہے کہیں پورا اور کہیں جزوی طور پر بدل بھی دیا گیا ہے مگر ہمارے بچپن کے ٹرین سٹیشنوں کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ سٹیشن کے آغاز پر لوہے کا ایک بڑا استون نصب ہوتا تھا جس کے سرے پر اوپر نیچے حرکت کرنے والا تختہ ہوتا تھا اگر اس تختے کا سرا نیچے ہوتا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ ٹرین سٹیشن میں دُخول کر سکتی تھی، اور اگر سرا اوپر کی طرف ہوتا تو داخلہ بند۔ یہ نظام خودکار نہیں تھا بلکہ اس کو زمین پر ایک لیور کانٹے کے آگے پیچھے کرنے سے حرکت میں لایا جاتا تھا۔ ریلوے کا جو اہلکار یہ کام کرتا تھا اس کو کانٹے کا جمعہ دار کہتے تھے۔ ان کی ایک اور ذمہ داری یہ تھی کہ ایک اور لیور کے ذریعے سٹیشن کی مختلف اطراف کی پٹریوں کے رخ کو آنے والی ٹرینوں کے لئے متعین کرتا تھا۔ جمعہ دار کے کام کی اہمیت یہ تھی کہ اگر وہ یہ دونوں کام سمجھ داری اور مستعدی سے نہ کرتا تو ٹرینوں کے مابین خونریز تصادم ہو سکتا تھا۔

سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ٹرین کے رکنے کا منظر خاصا دلکش ہوتا تھا۔ ٹرین کے آنے سے کچھ دیر پہلے مختلف خوانچہ فروش اپنے سٹال سجاتے تھے جن میں موسم کی مناسبت سے شربت اور چائے، پکوڑے، چھولے، گنے کی گنڈھیریاں اور متعدد دیگر چیزیں بکتی تھی

سٹالوں کے مالکان مخصوص آوازیں لگاتے تھے جن سے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی۔
ٹرین سٹیشن میں داخلے، پلیٹ فارم پر پہنچنے اور رکتے وقت ٹرین ہارن بجاتی تھی۔

اس مخصوص ہارن سے پورے علاقوں کے انسانوں، اور پرند و چرند کے کان مانوس ہو چکے تھے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ قدرتی اوازیں ہمیشہ کانوں کو بھلی لگتی ہیں جیسے پرندوں کی چہچہاہٹ، آبشاروں کا شور اور تیز ہوا سے درختوں کے پتوں کی سرسراہٹ۔ ان کے مقابلے میں مصنوعی آوازیں کانوں کو بھلی نہیں لگتی سوائے اُن آوازاں کے جو سالہا سال سے ماحول کا حصہ بن جاتی ہیں جیسے اونٹوں کے قافلے یا بکریوں کے ریوڑ سے آنے والی گھنٹیوں کی آوازیں، جیسے رہٹ کے پہیئے کی آواز اور جیسے ٹرین کا ہارن: یہ آوازیں، قدرتی آوازوں جیسا اثر چھوڑتی ہیں۔ درگئی اور آس پاس کے علاقوں کے لوگ ٹرین آواز کے ساتھ اپنی گھڑیوں کے ٹائم درست کرتے تھے، وقت کی پابندی اور ٹرین، آج کے پاکستان میں تو یہ ناقابل یقین ہے۔

ٹرین کے انجن سے متصل بوگی سے سفید وردی میں ملبوس افسر ہاتھوں میں سرخ و سبز جھنڈیاں لئے برامد ہوتا تھا اس کو گارڈ کہتے تھے، وہ اُترتے ہی تیز سیٹی بجاتا تھا۔ اس کے بعد ٹرین سے آنے والے مسافر نیچے اور چڑھنے والے اوپر ٹرین میں چڑھتے۔ بسا اوقات ان میں مڈبھیڑ بھی ہوتی تھی۔ اے کاش ہمارے لوگ نظم وضبط سے آشنا ہو جائیں۔ ہر چیز بدل گئی ہے مگر جو نہیں بدلی وہ ہماری عادتِ بدنظمی۔ ٹرین کے ضروری معائنے، کوئلہ و پانی بھرنے، اور جانے والے مسافروں کے سامان وٹکٹوں سے معلق رسمی کاروائی کے بعد، ٹرین ایک بار پھر ہارن بجاتی، گارڈ سبز جھنڈا لہراتا، واپسی کے سفر کا اعلان کرتے۔ اس کے ساتھ ہی سٹیشن پر اُداسی اور خاموشی ڈیرے ڈالتیں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ انسان کی زندگی بھی ٹرین کی مانند ہے۔ وہ زندگی کی ٹرین میں بیٹھ کر دنیا کے پلٹ فارم پر اُترتا ہے جس پر خوب گھما گھمی ہوتی ہے مگر اس کی امد کے ساتھ ہی کچھ لوگوں کی زندگی کا خاتمہ ہوتا ہے اور وہ واپسی کا ٹکٹ کٹواتے ہیں، موت کی ٹرین درد بھری آواز کے ساتھ عدم آباد کی طرف گامزن ہوتی ہے، حیف اے فانی وادھوری زندگی!

صبا ممتاز بانو، لاہور

کیا یہ بدن میرا تھا؟

آفتاب اپنی حدت کھو چکا تھا۔نقرئی کرنیں اس کے وجود میں پوری طرح سما چکی تھیں۔تختِ تاریکی بجھ چکا تھا۔نرم خود روگھاس نے پانی سے رازو نیاز شروع کردیا تھا۔پیڑوں کی دنیا آباد ہو چکی تھی۔راستے کو چُپ لگتی جارہی تھی۔اکا دکا مسافر گزرتا تو دھرتی کھنکنے لگتی۔ایسے میں ویران پگڈنڈی پر تیز تیز قدم اٹھاتی میں زمانے کو شکست دینے کی کوشش میں تھی۔مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی اور اسے گزر جانے کی۔میرا دل چاہا کہ بھاگ کر اس سے لپٹ جاؤں مگر وہ کب ہاتھ آتا تھا؟۔اس کے لمبے لمبے ڈگ میرے سو قدموں پر بھی بھاری تھے۔ویسے بھی ضرورت کے لمحوں میں دامن بچا کر گزر جانے کا ہنر اسے خوب آتا تھا۔

وہ نظامِ فطرت کا اسیر تھا۔میں تھوڑی سی بے رخی کیا برتتی ، وہ وفا کی زنجیروں سے رہا ہو جاتا اور بے وفائی کے جنگل میں اچھلتا کودتا مجھ سے آگے نکل جاتا۔آج بھی وہ مجھ سے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔اکا دکا مسافر بھی جب دغا دے گئے۔سوچ میری تمناؤں کی ہمرکاب ہوگئی۔

''بے وفا کہیں کا۔کیا ہوا ساتھ نہیں۔ابھی دو چار قدم اور چلوں گی تو لٹیا کو آواز دوں گی۔''

ایسا ہی ہوا۔جوں ہی دور ایک کٹیا کی مدھم روشنی نے میری آنکھوں کو جوت بخشی۔میں نے لٹیا کو آواز دی۔

لٹیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ایک ہی پکار پر کالے ریشمی بالوں والی لٹیا اچھلتی کودتی اور بھاگتی دوڑتی ہوئی میرے مقابل آکھڑی ہوئی۔

لٹیا کے تو جیسے کان ہی میری آواز پر لگے ہوتے تھے۔ایسے لگتا تھا اس کا دل اس کے کانوں میں بولتا رہتا تھا۔

"لواب آئی کہ اب آئی تیری مالکن۔"

میری پہلی صدا پر ہی وہ ہر مشکل کو اپنے پاؤں سے روندتی ہوئی میرے پاس پہنچ جاتی۔

لُٹیا کو دیکھتے ہی میرے گلابی عارض مہکنے لگے۔ جاندار مسکراہٹ نے میرے بھرے بھرے لبوں پر جگہ گھیر لی۔ خوف کی وجہ سے جمی پپڑ یاں خود بخود اکھڑنے لگیں۔ میرے ریشمی بالوں میں ہوا کنگھی کرنے لگی۔ ان کی سرسراہٹ سے دماغ کی حکومت کمزور پڑنے لگی۔ بدن کے فرش پر تمناؤں نے رقص کرنا شروع کر دیا۔ بلبل چہکنے لگی۔

"حزن نہ کوئی غمِ بربادی۔ آزادی جیسی آزادی۔"

میں وفورِ مسرت سے ہم کنار، خوش وقتی جذبوں سے مہکتی اور شب ماہتاب کی ضیا سے دمکتی ہوئی لٹیا کے سنگ سفر کرنے لگی

"زیست ہے تو میں ہوں۔ اگر یہ نہیں تو پھر کیا ہے۔ نگاہِ سرمگیں بھی نہیں اور خوشبوئے بدن بھی نہیں۔ واپسی کے سفر پر صرف حسرتوں کا قیام ہوتا ہے۔ جی بھر کر جیا جائے یا بندھ باندھ لیا جائے۔"

میری سوچوں میں مرغانِ خوش نوا محوِ پرواز تھے کہ لٹیا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ایک خیال نے مجھے پریشان کر دیا۔

"اور یہ لُٹیا اپنی محبت، اپنی شفقت اور اپنے تحفظ کی چھایا مجھ پر کیے ہوئے، کیا یہ ہمیشہ اسی طرح میرے ساتھ رہے گی یا میری سانسوں کے نڈھال ہوتے اور میرے شباب کے ڈھلتے ہی مجھے چھوڑ جائے گی۔ کیا اس کی عمر میری عمر کا ساتھ دے پائے گی۔؟"

"مالکن تم نے میرا نام لُٹیا کیوں رکھا۔" چلتے چلتے جانے اُسے یہ آج کیا سوال کرنے کی سوجھی تھی۔

"لُٹیا ہر سوال پوچھنے کے لئے نہیں ہوتا۔"

"مالکن ہر جواب سننے کے لئے ہوتا ہے۔ اگر حوصلہ ہو۔"

"بڑی حوصلے والی ہے تو میڈم فلاسفر۔ کتابیں پڑھتی ہے کیا؟"۔ میں اس کے دل کو

دُکھانا نہیں چاہتی تھی۔

"نہیں زندگی کو"۔لٹیا بھی آج مجھے لاجواب کرنے پر تلی ہوئی تھی۔میں نے لٹیا کو دیکھا جواب مجھ سے دو قدم دور ہٹ کر چلنے لگی تھی۔لٹیا کی اس حرکت سے دل رنجور ہوا۔دیدہ تر نے پلکوں کو بھگو دیا۔

"تو جانتی ہے نا لٹیا۔کتنے ہی تیرے اردگرد منڈلاتے تھے۔تجھ پر اپنی رال ٹپکاتے تھے۔ہر کوئی تجھے لوٹنے کی فکر میں رہتا تھا۔تیرا نام لٹیا نہ رکھتی تو کیا رکھتی۔"

"چھوٹی تو مجھے بِٹیا کہتی ہے۔"اس کے لہجے میں گِلہ نمایاں تھا۔

"تجھے کیا اچھا لگتا ہے۔"میں نے اس سے پوچھا۔

"مجھے تو بِٹیا اچھا لگتا ہے۔مالکن چھوٹی بہت بڑی ہے نا۔؟" آج وہ مجھے پوری طرح زچ کرنے پر کمر بستہ تھی۔

"اری،"بِٹیا اور لٹیا" میں فرق ہی کتنا ہے۔؟ ب کے نیچے سے نقطہ اور زیر ہٹا لو اور اوپر پیش ڈال دو۔اس کا قد لمبا کر دو اور پھیلاؤ تھوڑا زیادہ کر دو۔بس اتنی سی بات ہے۔"

"اتنی سی بات کہاں ہے مالکن۔چیزوں کو ان کے اصل مقام سے ہٹا دیا جائے تو باقی کچھ نہیں رہتا۔عزت دیواروں سے لگ کر روتی ہے اور بدنامی انہیں پھلانگ کر باہر نکل جاتی ہے۔بیٹیاں لٹنے لگتی ہیں اور ضمیر فروشوں کی چاندی ہو جاتی ہے۔سودے بازی یا جبر کا کالا ناگ عزت نفس کو ڈس لیتا ہے۔لالچ کا راج ہو جاتا ہے۔"لٹیا کی باتوں نے مجھے حیران پریشان کر دیا۔"یا اللہ کہیں لٹیا کے دن تھوڑے تو نہیں رہ گئے۔"

"لٹیا،تو بھی تو کالی ہے۔"میں نے لٹیا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"یاد کر مالکن جب میں پیدا ہوئی تھی تو کیا کالی تھی۔اوج ثریا تک جانا ہے تجھے اور مجھے سیاہی کے سفر پر رہنا ہے۔"

کسی سیانے نے کہا تھا کہ سفر باتوں میں ہو تو آسانی سے کٹ جاتا ہے۔آج ایسا ہی تو ہوا تھا۔

کٹیا جونہی آئی، لٹیا نے میرے ریشمی لبادے سے کھیلنا شروع کر دیا۔ میں نے بیگ سے گوشت کے ٹکڑے نکالے اور لٹیا کو ڈال دیئے۔لٹیا نے سیر شکم ہو کر بھی پیاسی نگاہوں سے مجھے دیکھا تو میں اس کے من کی بات سمجھ گئی اور خاکی لفافے سے کیک نکالا۔

"بڑی ندیدی ہے تو۔ میٹھا بھی کھائے گی"۔لٹیا نے جواب دینے کی بجائے کیک میرے ہاتھوں سے چھین لیا۔

لٹیا کے مطمئن ہونے کے بعد میں نے جونہی قدم اندر بڑھائے۔سکون میرے بدن میں ہلکورے لینے لگا۔ نیند مجھ سے محبت کا تقاضا کرنے لگی۔

"ایک اور رات محفوظ پناہ گاہ میں بسر ہو جائے گی۔ ہاتھوں کی دنیا جب تک آباد رہے گی۔سعی مسلسل تو کرنا ہوگی۔آبلہ پائی بھلے ستم ڈھائے لیکن امید تو اپنی جگہ شاداب کھڑی ہے، زندگی موت کے آنے تک سنبھل ہی جائے گی۔"

میں درماندہ حال نے خوش خیالی کے ساتھ اپنے آستاں میں پناہ لی اور لٹیا گھر کے باہر مورچہ سنبھال آ کر بیٹھ گئی۔اس رات بدن کو حرارت نے گھیر لیا۔ چاند جیسے مکھڑا اکملا گیا۔ تیسرے روز طبیعت سنبھلی تو من باہر جانے کو مچلا۔

شال کو جسم پر لپیٹا اور باہر نکل گئی۔"لٹیا، چل آ۔ ٹہلتے ہیں۔"

لٹیا تو مجھے دیکھتے

ہی نہال ہو گئی۔اس کی باتوں میں شہد سا گھل گیا۔

"حسن جاناں ہے کچھ عنابی سا۔کتنے دنوں کے بعد تمہارا مکھڑا دیکھا ہے مالکن۔بدن سے ضیا پھوٹ رہی ہے اور مخمور آنکھوں کا حسن دوآتشہ ہو چکا ہے۔ بیماری میں کوئی یوں بھی خوبصورت ہوتا ہے۔"

باتوں باتوں میں ہم سرحد کے پاس پہنچ گئے۔میرا دل تھا آج بن سے نکل کر دیکھوں۔میں نے جونہی حدِ فاصل کو پار کرنے کی کوشش کی۔لٹیا مچلنے لگی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں آگے جاؤں۔آخر کیا تھا بن کے پار۔؟ میں دیکھنا چاہتی تھی

اور لٹیا مجھے روکنا چاہتی تھی۔ آخرکار لٹیا نے فیصلہ کن انداز میں میری طرف دیکھا اور اپنے پاؤں اٹھائے۔ "پہلے میں جاؤں گی۔"

اب اسے روکنا بے سود تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ہٹ کی پکی ہے۔ رات کی سیاہی کو چیرتی ہوئی وہ اندھیرے میں روپوش ہوگئی۔ کچھ پل ٹھہر گئے اور پھر ساعتوں کی خاموشی چیخم دھاڑ میں بدل گئی۔ " کون تھا؟ کون تھا؟"

" مجھے لٹیا کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔ مجھے اس کی بات نہیں ماننی چاہیے تھی۔ وہ تو سدا کی پگلی ہے۔"

تیز و تند طوفان، چنگھاڑتی ہوئی آوازیں، ساعتوں کو بہرا کر دینے والی دھاڑیں اور میرا ساکت ہوتا ہوا بدن۔ میں نے قدم اٹھانے کی کوشش کی لیکن میں تو پتھر کی بن گئی تھی۔ میرا پیرہن پھٹ چکا تھا۔ میرا جسم حرکت نہیں کر رہا تھا۔ بس دماغ کام کر رہا تھا۔ لیکن وہ ایک ساعت پھر اس کے بعد جیسے کسی نے مجھ میں جان ڈال دی ہو۔

میں اپنا فگار فگار بدن سنبھالتی سرپٹ اس طرف دوڑی جدھر لٹیا گئی تھی۔ کالے بالوں اور بھورے پاؤں والی لٹیا کا زخمی بدن خاک پر پڑا تھا۔ روحیں چیخ رہی تھیں۔

میں نے اس کی پتلیوں میں جھانکا۔۔۔۔ "میرا عکس"

کیا یہ بدن میرا تھا۔؟

زاہد محمود زاہد، ملتان

خود کو ہم سامنے بٹھاتے ہیں — اور پھر حوصلہ بڑھاتے ہیں
کیا یہ کم ہے کہ بھیڑ میں ہم لوگ — روز اک راستہ بناتے ہیں
پیار کی جب بھی اوس پڑتی ہے — دل کی شاخوں پہ پھول آتے ہیں
عمر کا ایک سال کم ہوا ہے — آؤ مل کر خوشی مناتے ہیں
جایئے عہد کیا نبھائیں گے آپ — آپ تو نام بھول جاتے ہیں
کون ہے جس کو آزمایا نہیں — آیئے خود کو آزماتے ہیں

نورالعین ساحرہ، ورجینیا، امریکا

آخری کہانی

اس بار بھی تم نے میری بات پہ غور نہ کیا تو یاد رکھنا۔۔۔ !آسماں پھٹ جائے گا اور زمین کا سینہ شق ہو جائے گا جس میں تم اپنی منافقت اور فرسودگی سمیت دفن کر دیے جاؤ گے۔یوں تو میں نے پہلے بھی کئی بار تمہیں ایسی دردناک کہانیاں سنائیں اور تم سنتے رہے، بغیر کسی احساس کے۔۔۔۔۔۔۔لیکن اس آخری کہانی کو میں نے اپنے خون سے کشید کیا ہے۔کل جب کالا کپڑا میرے چہرے پر ڈال کر پیروں تلے سے زمین کھینچ لی جائے گی اور میری روایت شکن زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دی جائے گی تو یہ مت سمجھ لینا، آفت ٹل گئی۔ یہ تو شاید پہلی عورت کی آخری کہانی ہے۔آنے والے وقت میں یہ کہانیاں شدت سے دہرائی جائیں گی فرق ہوگا تو بس اتنا کہ وہ میری بجائے تمھارے خون سے لکھی ہوں گی۔تو اب سنو ۔۔۔۔میرا نام، خیر چھوڑو میرے نام سے تمہیں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے بھلا !بس اتنا کافی نہیں کہ میں ایک ایسا وجود ہوں جس سے لذت پانا ہی تمہارا مذہب ہے۔ جب میں جوان ہوئی۔ چونک گئے نا !عورت کی جوانی پہ کیسے تمھارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ خیر میں بتا رہی تھی کہ میں جبر کے سائے میں بڑی ہوتی ایک ایسی سٹیج پہ پہنچ گئی جہاں میرا وجود میرے باپ کی پیشانی پر لکریں کھینچنے لگا۔اسی لئے روایت کی ہاں میں ہاں ملاتے اپنی ذات کی ہجرت پہ مجبور کر دی گئی۔تم مرد ذات بڑے سفاک گورکن ہو، تمہیں یاد ہیں ناں وہ تمام واقعات، بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کرنے والے، تم ہمیشہ ہی بہانے بنا بنا کر عورت کے سارے خوابوں، تمناؤں اور خوشیوں پہ مٹی ڈالتے رہتے ہو۔جیسے اب میری بغاوت پہ ڈالنے والے ہو۔اسی لئے مرنے سے پہلے آج تمہیں یہ ہولناک کہانی سنانے پہ مجبور ہوگئی ہوں تاکہ تمہاری آنکھوں پہ پڑے آسیبی جالے ہٹ جائیں اور تم میری ذات کا مکمل احاطہ

کر سکو۔

جونہی میں نے ہوش سنبھالا، یا یوں کہو کہ ہوش سنبھالتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ "اف" میرے صبر کی دشمن ہے، کسی بھی حال میں اف نہیں کر سکتی۔ روایتوں کی پاسداری کی بازگشت میرے کانوں میں گونجتی رہی اور ابھی پوری طرح آنچل سنبھالنا بھی نہ سیکھ پائی تھی کہ میرا وجود سب کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ میرا قصور صرف اتنا تھا کہ قدرت نے مجھے اچھی شکل سے نوازا تھا اور تم جانتے ہی ہو ہمارے معاشرے میں خوبصورتی کیسے لڑکیوں کے لئے وبال جان بن جاتی ہے۔ ہر گزرتے دن مجھے محسوس ہوتا جیسے ہر کوئی مجھے بالشت بھر بھر ناپتا ہے۔ ویسے اگر تم مجھے جسم کے علاوہ بھی جاننا چاہتے ہو تو جاؤ تاریخ کے اوراق کا مطالعہ کرو، دیکھو کیسے تم نے حقائق کی روح مسخ کرتے ہوئے صرف منافقت کی آنکھ سے مجھے دیکھا ہے۔ تمہیں لفظ فی میل ،عورت، مستور اور خاتون کے معنی بھی پھر سے بغور دیکھنے ہونگے۔۔۔۔ تمہیں شاید معلوم نہیں۔۔۔۔ یہ لفظ نہیں، ذلت اور کم مائگی کی زنجیریں ہیں جو مرد نے۔۔۔، کسی تمہارے ہی جیسے مرد نے عورت کو جانے اور پہچانے بغیر صدیوں سے پہنا رکھی ہیں۔ ارے یہ اچانک تمھارے ماتھے پر بیزاری کی سلوٹیں کیوں؟ میرا اپنے حق کے لئے لڑنا تمھیں اچھا نہیں لگتا نا؟ ہاں بھئی آئینہ میں اپنا کریہہ چہرہ کون دیکھنا چاہے گا۔ اچھا چلو چھوڑو یہ منہ دکھائی کی رسم پھر کبھی سہی ، ابھی تم میری کہانی سنو۔۔۔۔۔ ہاں یاد آیا۔۔۔۔۔ اس کہانی کو سمجھنے سے پہلے اس پچاس سالہ رنڈوے کردار کو تو جان لو جسے اس وقت میرے پہلے شوہر کے رتبے پر فائز کر دیا گیا جب میں صرف سولہ سال کی تھی۔ شادی کے دو سال بعد جب وہ زبردستی مجھے طلاق دینے پر اتر آیا تو میرے سسرال والے سخت پریشان ہوئے۔ وہ میرے شوہر کو پاگل سمجھ رہے تھے جو اتنی کم عمر، نیک سیرت، حسین صورت اور انتہائی خدمت گزار بیوی کو بلاوجہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ اس پر چیخ رہے تھے، بری طرح چلا رہے تھے اور وجہ جاننا چاہتے تھے۔ جواب میں ہم دونوں چپ تھے جیسے پتھر کے مجسمے۔ زبان کھولیں بھی تو کیسے۔۔۔ دونوں ہی ظلم کی حد تک اپنے معاشرتی رسم ورواج کے

کفنائے ہوئے۔ وہ کیسے اپنے گھر والوں کو بتاتا کہ وہ تو کسی اور ہی دنیا کا باسی تھا۔ اس کو میرے جیسی سمٹی سمٹائی لجاتی ہوئی کچی عمر کی بیوی بالکل پسند نہیں آئی تھی۔ میری شرم وحیا اس کے خوابوں کا تاج محل ڈھیر کر دیتی تھی اور وہ بےبس پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر رہ جاتا۔ پیاسا آتا اور تہ در تہ لپٹی جذبوں کی گھڑی پوری طرح کھل نہ سکنے کے باعث پیاسا ہی گالیاں دیتا، پیر پٹختا نکل جاتا۔ میں اپنی انا اور خودداری اس کے پیروں پہ رکھے گڑگڑاتی رہی مگر وہ کسی طور نہ مانا۔ اس کے بقول مجھ سی سرد لاش کے ساتھ ٹھٹھرنے سے کہیں بہتر تھا کہ خود کو بازاری شعلوں سے گرما لیا جائے۔ دو سال تک بچہ نہ ہونے کو جواز بنا کر طلاق کی تینوں برچھیاں میرے سینے میں اتار کر بولا "تو اپنے گھر جا کر بوڑھے باپ کی خدمت کر میری زندگی میں تیرے جیسی نیک پروین کی کوئی جگہ نہیں ہے"

ارے۔۔۔۔حیرت سے چہرہ کیوں بگڑنے لگا تمھارا، ابھی تو یہ ابتدا ہے۔۔تمارے لئے میری زندگی الف لیلوی داستاں جو بن گئی ہے۔ کیا واقعی تم نے مجھ پر صدیوں سے روا ظلم وستم کی داستانیں اس سے پہلے نہیں سنی؟ سنی تو ضرور ہیں، مجھ سے بھی، مگر حسب دستور دوسرے کان سے نکال دی ہوں گی۔ تمھیں کسی سے پیار ہو ہی نہیں سکتا۔ محبت کی جمالیات تم کیا جانو، تم تو وصل کے میدان میں بھی جنگی لباس پہن کر اترتے ہو تا کہ عورت کو فتح کیا جا سکے۔ کیا میں تمھیں نہیں جانتی؟ تمہارے ماتھے پہ لکھا ہے کہ میرا پراسرار حسن اور بڑا عہدہ تمھاری نام نہاد مردانگی کے لئے ہمیشہ چیلنج بنا رہتا ہے۔ اوہ۔۔۔ میں بھی کیا بات بے بات دل کے پھپھولے پھوڑنے بیٹھ جاتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ تمھارے ضبط کا بند ٹوٹ جائے کہانی کا دوسرا حصہ سنو۔ میرے ماتھے پر لگا طلاق کا داغ میری بدبختی کی طرح گہرا ہوتا جا رہا تھا اور میں چار سال تک خود کو یقین دلانے کی ناکام کوشش کرتی رہی کہ واقعی مجھے میری پارسائی اور باحیا ہونے کی ایسی بھیانک سزا ملی ہے۔ جب یقین آ گیا تو دھیرے دھیرے خود کو بدلنا شروع کر دیا کیونکہ میں دوبارہ زندگی میں اتنا بڑا نقصان اٹھانے کو تیار نہیں تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ آزاد خیالی کی نئی منزلیں طے کرتی چلی گئی۔ شرم وحیا کو

اپنے بدن سے نوچ نوچ کر جب میں کسی اندھے کنوئیں میں پھینک رہی تھی تو اس وقت تم میری گھائل روح کی اذیت کو نہیں سمجھ سکتے ۔ پھر میں مر گئی اور میرے اندر ایک سفاک اور بے باک عورت نے جنم لیا جسے دیکھ کر فاحشہ بھی شرما جاتی ۔ اپنی دوسری سہاگ رات میں نئے شوہر کو بے حیائی کے ایسے ایسے جلوے دکھائے کہ اس کی مردانگی ٹھٹھرتی ہوئی کسی کونے میں منہ چھپا کر جا سوئی ۔ میں نے جو سوچا تھا وہی کر دکھایا ۔ اس کے ہوش اڑ گئے اور وہ مفعول بنا میرے اشاروں پر ناچتا رہا ۔ اب مجھے کبھی ٹھکرایا نہیں جا سکتا تھا ۔ ویسے بھی رہا سہا خوف میرے بھاری جہیز اور طلاق کی صورت میں ملنے والے حق مہر نے دور کر دیا تھا جسے وہ اپنی تنخواہ سے کبھی ادا نہیں کر پاتا ۔ زندگی اب کافی پرسکون ہو گئی تھی ۔ اگر کچھ شکایت تھی تو بس اتنی کہ اس کو زیادہ بولنے کی عادت نہ تھی اکثر چپ چاپ بیٹھا خلاؤں میں جانے کیا گھورتا رہتا یا پھر میرے گھر کے کام کاج ختم ہونے سے پہلے ہی سو جاتا ۔

شروع کے چند مہینے جب میری گود ہری نہ ہوئی تو دبا دبا سسرالی احتجاج شادی کے دو سال بعد بانجھ پن کے الزام میں ڈھل گیا اور میرے شوہر کی دوسری شادی کی باتیں ہونے لگیں ۔ زیادہ صدمے کی بات تو یہ تھی کہ میرا شوہر بھی اپنے گھر والوں کا ہم خیال نظر آ رہا تھا ۔ میری ساری محبتوں ، وارفتگیوں اور قربانیوں کی کوئی قیمت ہی نہ تھی ۔ میں تو جیسے کہیں موجود ہی نہ تھی ۔ اس کو صرف اولاد سے غرض تھی ۔ یہ دیکھ کر میرے قدموں تلے سے زمین نکل گئی ۔ میں دوبارہ طلاق شدہ ہونے کو ہرگز تیار نہ تھی اور دوسرا کوئی راستہ بچا ہی نہ تھا ۔ اپنی شادی بچانے کے لئے میں کسی حد تک بھی جا سکتی تھی سنا تم نے ۔۔۔۔۔۔ ! کسی حد تک بھی ۔۔۔۔۔۔۔ میری کہانی کی جزیات نگاری کو محسوس کئے بغیر تم میری روح کا کرب نہیں سمجھ سکتے ۔ جبر میری لوکیل ، استحصال میرا بھرم ، خواب میری ذات کا استعارہ ، خوف میرا بیانوی وقت ، اور پھر ایک دن ہمت کر کے یہ ساری زنجیریں میں نے توڑ ڈالیں لیکن آہ ۔۔۔۔۔۔ ! کیا علم تھا کہ ایک بھیانک کہانی کو جنم دوں گی ۔ جب ساری دعائیں اور دوائیں بے اثر رہیں تو فوری اولاد حاصل کرنے کے لئے کالے جادو کے ماہر ایک کریہہ

صورت خبیث بڈھے کے ہاتھوں کھلونا بن گئی ۔ غلاظت اور بدبو سے بھرپور گندی تاریک کوٹھری میں جب وہ میری مجبوری کی من مانی قیمت وصول کر رہا ہوتا تو دل چاہتا کہ اس کے سینے میں خنجر اتار دوں ۔ گھر آ کر بھی دیر تک جی متلاتا اور گھنٹوں نہانے سے بھی روح کی غلاظت دور نہ ہوتی ۔تم کیا جانو کہ تمھاری نسل کو جنم دینے اور قائم رکھنے کے لئے میری روح کو کیسے بانجھ ہونا پڑتا ہے ۔ مجھے ہر حال میں ماں بننا تھا۔اس کے لئے آنے والے کئی سال تک "خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں "جیسے فلسفے پر اعتقاد رکھنا ممکن نہ رہا تھا۔ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود اس جھوٹے اشتہاری بابے کو سچ مان کر اپنے جسم کی بھینٹ تک دینے پر مجبور ہو گئی۔اس خبیث جادوگر کے بقول نوچندی جمعرات میری فتح کی رات تھی اور اس کے بتائے طریقوں پر عمل کر کے اس دن میری گود بھر جانی تھی ۔ میں نے باقی سب پوشیدہ رکھ کر اپنے شوہر کو صرف یہ بتایا کہ جمعرات کو آدھی رات کے بعد قبرستان میں خصوصی وظائف کرنے سے میں ماں بن سکتی ہوں ۔سب سے چھپ کر بالکل اکیلے جانا ہوگا ورنہ وظیفہ الٹا ہو جائے گا اس لئے اپنے باپ کے گھر جا رہی ہوں جہاں سے قبرستان بھی قریب ہے ۔ پہلے تو وہ ڈر گیا اور سختی سے مجھے منع کر دیا لیکن پھر جانے کیا سوچ کر اجازت دے دی۔اپنے بچے کے تصور سے ہی اسکی آنکھوں میں خوشی اور سرشاری کی انوکھی چمک آ گئی اور وہ بہت شوق سے میرے قبرسان آنے جانے کا وقت پوچھنے لگا۔

وہ ایک سرد خون کو رگوں میں جما دینے والی بھیانک شام تھی ۔ میں اپنے میکے آ چکی تھی اور اپنے بوڑھے باپ کے کھانے میں نیند کی دوا ملا کر اسے سلا دیا تھا۔ بہن بھائی کوئی تھا ہی نہیں ۔ ماں بھی بچپن میں مر چکی تھی ۔سو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے ۔ کچھ دیر پہلے ہی دوسرے محلے سے کزن کے تین سالہ بیٹے کو چپکے سے مٹھائی کا لالچ دے کر اپنے گھر لے آئی وہ مجھ سے ویسے بھی مانوس تھا۔خوشی خوشی لپک کر گود میں آ گیا۔ مامتا کے نشے میں دھت میں نے کسی کی معصوم مسکین اولاد کو دودھ میں نشہ آور دوا پلا کر بستر کے نیچے سلا دیا۔وہ ڈھونڈنے آئے تو بالکل انجان بن گئی ۔ کہرام برپا کرنے والی ماں تو سال پہلے دنیا چھوڑ گئی

تھی اور باپ دوسرے ملک مزدوری کرتا تھا سو باقی لوگ جس طرح اسے تلاش کریں گے مجھے سب معلوم تھا۔ آج عمل کا دن تھا اور راجھد انی کی رات ۔ میں ہمیشہ کے لئے اپنے شوہر کے دل میں جگہ پانے اور جنت کو زبردستی اپنے قدموں میں لے آنے والی تھی ۔ یہ بھی سوچے بنا کہ جنت کا راستہ ابلیس کے گھر سے کیونکر مل پائے گا۔

یہ رات کا دوسرا پہر تھا۔قبرستان میں ہولناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔میرے ایک ہاتھ میں مقدس کتاب اور بالٹی تھی جس کے اندر ایک تیز دھار خنجر ،الو کے پر، بندر کا دماغ ،اونٹ کی ہڈیاں اور میرے شوہر کے سر کے بال تھے ۔دوسرے ہاتھ سے نشے میں لڑکھڑاتے بچے کی انگلی تھامے دھیرے دھیرے ایک مخصوص قبر کی طرف بڑھ رہی تھی ۔ننھا بچہ کچھ نینداور کچھ خوف میں ڈوبا بار بار میری گود میں چڑھنے کی ناکام کوشش کرر ہا تھا۔رونے کی کوشش بھی کرتا تو میں اسے مٹھائی کا لالچ دے کر چپ کرا دیتی ۔ پھر وہ خوف زدہ آواز میں اپنی دادی کے پاس جانے کی ضد کرنے لگا۔اس کے چھوٹے چھوٹے ٹوٹے پھوٹے جملے اور اس کے ہاتھ کا لمس میرے جسم میں مامتا کی گرمی پیدا کرر ہا تھا۔ بار بار جی چاہتا سب کچھ یہیں چھوڑ کر اسے سینے میں چھپا کر گھر چلی جاؤں،مگر کونسے گھر، جہاں مجھے بے آبرو کرنے کی پوری تیاری کر لی گئی تھی؟ دوسری بار میرے سر سے چھت چھین کر معاشرے کی ٹھوکروں میں روندا جانے والا تھا۔نہیں، اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی ۔ان ہی خیالوں میں الجھی میں اپنی مطلوبہ قبر تک پہنچ گئی ۔ ذہن میں فکر وغم کے اتنے جھکڑ چل رہے تھے کہ قبرستان میں پھیلی خوف اور سناٹے کی گونج بھی مجھے سنائی نہ دے رہی تھی ۔ بچہ گھبرا کر رونے لگا تھا۔اس کی آواز سن کر کوئی بھی وہاں آ سکتا تھا اس لئے اس کو چپ کروانا بہت ضروری ہو گیا تھا ۔ایک جھٹکے سے اسے گھسیٹ کر زمین پر گرا دیا۔ میرے ہاتھوں کی سرد بے رحمانہ گرفت سے وہ بری طرح سہم گیا۔ آہ۔۔۔۔۔۔کاش میں عورت نہ ہوتی ،کاش میں اتنی مجبور نہ کر دی گئی ہوتی ۔اپنی بےبسی پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی ۔ میری سسکیاں سن کر بچہ رونا بھول گیا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔اس نے زمین پر لیٹے لیٹے اپنا ننھا سا ہاتھ بڑھا کر

میرے گال سے آنسو صاف کرنا چاہے۔اسی لمحے میں نے اپنی آنکھیں بند کیں اور سانس روک کر اس کے گلے پر خنجر چلا دیا۔ننھا سا ہاتھ میرے گال پر ٹکا تھا اور وحشت بھری بے اعتبار آنکھیں میری روح میں شگاف ڈال رہی تھیں۔اس کی گردن سے خون کی تیز دھار بھل بھل بہنے لگی۔ایک پل کو ایسا لگا جیسے زمین آسمان نے گھبرا کر آپس میں جگہ بدل لی ہو۔کائنات نے پلک جھپکنے میں سوگ کی گہری چادر اوڑھی اور قبریں وحشت سے پہلو بدلنے لگیں۔چاند نے دہشت زدہ ہو کر کالے بادلوں میں پناہ لی اور زمین پر انسانیت کا جنازہ نکل گیا۔میں اس وقت اپنے حواس میں نہ تھی۔کسی معمول کی طرح اس خون کو تیزی سے بالٹی میں بھرلیا۔اس کے بعد جادوگر کے حکم کے مطابق بھاری پتھر سے اس کے نازک بدن کو اچھی طرح کچلنے لگی تا کہ لاش کو پہچانا نہ جا سکے۔خون بھرے گوشت کے لوتھڑے اڑ اڑ کر دور تک جا رہے تھے اور میں بےحس بنی اس پنجر پہ ضربیں لگا رہی تھی۔اس کے بعد ساری چیزوں اور مقدس کتاب کو ایک خاص ترتیب سے قبر پر الٹا رکھا۔خود بےلباس ہو کر اس کے اوپر بیٹھ گئی۔یہ وہ کتاب تھی جس کو عام حالت میں چھوتے بھی ڈرتی تھی کہ بے ادبی نہ ہو جائے لیکن میری مجبوری نے آج مذہب کو بھی میرے تابع کر دیا تھا۔

اس کہانی میں ہر سوال کا جواب موجود ہے تا کہ تمہارے جیسے غیرت مند قاری مجھے ظالم خودغرض اور بےحس کہنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکیں۔یہ سب میں نے کس لئے کیا۔؟؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صرف تمھاری نظر میں معتبر ہونے کو ناں۔۔۔۔!اور تم نے مجھے بدلے میں کیا دیا؟ دیا بھی کہاں؟ تم نے تو ہمیشہ مجھ سے صرف لیا ہی لیا۔۔۔آج جبکہ میرا دل غم سے پھٹ چکا ہے اور میں فنا ہو چکی ہوں، مرنے سے پہلے تمھاری اس نام نہاد عظمت کو دھتکارتی ہوں۔اپنے پیروں تلے روندتی ہوں۔۔۔۔۔آخ تھو۔۔۔۔۔ویسے بھی جب یہ کہانی تم تک پہنچے گی میری لوکیل زمین کے سات فٹ اندر بے نام ونشان پتھریلی چاردیواری بن چکی ہو گی جہاں مدتوں کے لئے وقت ٹھہرا ہوا ہے اور تمام جذبے پتھرائے ہوئے۔لرزہ طاری کرنے والے اختتام سے پہلے مجھے تم سے کچھ ضروری سوال

کرتے ہیں۔ ذرا سوچ کے بتاؤ تمھارا کلیجہ کیوں نہیں پھٹتا جب تم مجھے ونی اور ستی کرتے ہو۔ کبھی میرے ناک کان کاٹتے ہو تو کبھی تیزاب ڈالتے ہو۔ یہاں قرآن سے میری شادی کر دی تو وہاں جرگے میں گائے بھینسوں کے ساتھ گن کر دشمنوں کے حوالے کر دیا۔۔۔ تم شرم سے مر کیوں نہیں جاتے جب میں صرف چار سال کی ہوتی ہوں اور تم چالیس سال کے چار مرد مل کر میرے نازک کومل بدن کو چیتھڑوں میں بدل دیتے ہو۔ تف ہے تمھاری بے غیرتی پر۔ میرے پاس اب وقت بہت کم ہے، کہانی اپنے اختتام جسے تم ایک خونی کلائمیکس کہو گے، کی طرف تیزی سے بھاگتی جا رہی ہے۔ اسی طرح قبر پر بیٹھے بیٹھے میں نے کچھ منتر پڑھے اور بچے کے خون سے نہانے لگی۔ درختوں کے بھیانک ہیولے طویل ہو کر میری طرف یوں بڑھ رہے تھے جیسے عفریت ہوں اور میرے بھاگنے کی راہیں مسدود کر رہے ہوں۔ اسی لمحے اچانک آسماں پھٹ پڑا اور موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ میں جلدی جلدی اپنے منتر ختم کر کے بچے کے بچے کھچے پنجر کو ایک گڑھے میں ٹھونسا اور اس کو مٹی سے بھرنے لگی۔ جب میں ایسا کر رہی تھی تو اس کی اڑتی ہوئی ایک انگلی ماںتا کے منہہ پر طمانچہ بن کر میرے گال سے ٹکرائی اور ایسا لگا جیسے میں ہمیشہ کے لئے بانجھ ہو گئی۔

اسی تیز بارش میں نہا کر میں صاف ہوئی اور جلدی جلدی چیزیں سمیٹ کر گھر کی طرف بڑھنے لگی۔ ایک نظر ننھی قبر کو دیکھا تو جی چاہا کہ کاش کوئی میرا بھی یہی انجام کر دے۔ اس وقت جب میرے جسم پر پچھتاؤں کا لرزہ طاری تھا اور دماغ، دل کو تنہا چھوڑے بھاگا جا رہا تھا کہ قبرستان سے باہر نکلتے ہی اپنے شوہر کو منتظر پایا۔ اس کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولا "تجھ سے جان چھڑانے کے لئے بہت دنوں سے موقع ڈھونڈ رہا تھا۔ طلاق تجھے دے نہیں سکتا اور تیرے ساتھ ایک پل رہنا مجھے گوارا نہیں۔ تجھے جان سے مار کر اب میں شرمیلی اداؤں والی کسی حیادار عورت سے شادی کروں گا تا کہ میری مردانگی کی تسکین ہو سکے۔ تو نے تو الٹا مجھے ہیجڑا بنا رکھا ہے کنجری "الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ۔ مجھ میں کچھ اور سننے سمجھنے کی سکت نہ رہی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ میں پکڑی رسی میرے گلے میں

پھندہ بنا کر ڈالتا میں اپنا تیز دھار خنجر اس کے دل میں اتار چکی تھی۔ اس کے جسم سے نکلتا گرم گرم خون میرے پیروں کو بھگو رہا تھا۔ وہ زمین پر گرا تڑپ رہا تھا اور میرے ذہن میں لفظ کنجری کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ہاں اس نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ میں ابھی تک مسلسل ایک کے بعد دوسرے مرد کے اشاروں پر ناچتی ہی تو آئی تھی۔ کم سے کم اس خبیث بڈھے جادوگر نے تو مجھے واقعی بنا کر چھوڑا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی میں نے جھک کر اپنے شوہر کے سینے میں گھسے خنجر کو کھینچ کر باہر نکالا تو خون کے ساتھ ساتھ گوشت کے لوتھڑے بھی آ گئے۔ اسے بارش کے پانی اور شوہر کے کپڑوں سے اچھی طرح صاف کیا اور شراب کے نشے میں دھت سوئے کالے علم کے ماہر خبیث جادوگر کو جا لیا۔ اسے تو چیخنے اور تڑپنے کا موقع بھی نہ ملا۔ اس کا کوئی جادو بھی خود اسے نہ بچا سکا۔ میں سراپا قہر بنی اس وقت تک خنجر کے وار کرتی رہی جب تک لوگوں نے مجھے پکڑ کر پولیس کے حوالے نہ کر دیا۔۔ میں تمہاری طرح نہیں، میں نے جو بھی کیا عدالت میں اس کا اعتراف بھی کیا، لو میری آخری کہانی تمام ہوئی اور جلاد مجھے لینے آ پہنچے ہیں۔۔ میں جا رہی ہوں مگر تم یہ مت سمجھ لینا کہ آفت ٹل گئی............

حسن عباسی، لاہور

مرتی ہوئی زمیں کو بچانا پڑا مجھے
بادل کی طرح دشت میں آنا پڑا مجھے

وہ کر نہیں رہا تھا مری بات کا یقیں
پھر یوں ہوا کہ مر کے دکھانا پڑا مجھے

بھولے سے میری سمت کوئی دیکھتا نہ تھا
چہرے پہ ایک زخم لگانا پڑا مجھے

اس اجنبی سے ہاتھ ملانے کے واسطے
محفل میں سب سے ہاتھ ملانا پڑا مجھے

یادیں تھیں دفن ایسی کہ بعد از فروخت بھی
اُس گھر کی دیکھ بھال کو جانا پڑا مجھے

اُس بے وفا کی یاد دلاتا تھا بار بار
کل آئینے پہ ہاتھ اٹھانا پڑا مجھے

ایسے بچھڑ کے اُس نے تو مر جانا تھا حسنؔ
اس کی نظر میں خود کو گرانا پڑا مجھے

فیروز عالم (کیلی فورنیا)

گھروندے اَنا کے

نرسنگ ہوم کی ملازمہ نے اس کی پہیوں والی کرسی دھکیل کر برآمدے میں کھڑی کر دی۔

میں اس نرسنگ ہوم میں کبھی کبھی کسی مریض کو دیکھنے چلا جاتا تھا۔ کیلی فورنیا کے ساحل پر بنا یہ نرسنگ ہوم ہسپانوی طرزِ تعمیر کا تھا اور اس کے برآمدے میں بنی محرابوں میں پھولوں کی ٹوکریاں لٹکی ہوئی تھیں۔ میرے سامنے ایک جانب حد نگاہ تک نیلا سمندر پھیلا تھا اور دوسری جانب سانتا باربرا کے خوبصورت سرسبز پہاڑ جن پر جا بجا رنگین پھول کھلے تھے۔ مجھے جس بوڑھی مریضہ کو دیکھنے بلایا گیا تھا وہ میری ہم وطن تھی اور شاید اس معاملے میں میرے انتخاب کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ میری ہم زبان تھی۔ اس پر حال ہی میں فالج کا شدید حملہ ہوا تھا۔ ہاتھ پیر ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھیں ترچھی ہو گئی تھیں۔ زبان موٹی ہو کر گولہ سا بن کر حلق میں پھنس گئی تھی اور دیکھنے والوں کو ظاہری طور پر لگتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو چکی ہے اور زندگی سے اس کا رشتہ صرف سانس کی حد تک قائم ہے۔

اس کا کوئی عزیز یا وارث بھی نہ تھا اس لیے مجھے اس سے ایک خاص انسیت ہو گئی۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور اس کی بچوں جیسی غوں غاں کو غور سے سمجھنے کی کوشش کی تو مجھے معلوم ہوا کہ اس کا ذہن بالکل صحیح اور نارمل ہے۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ جب کوشش کر کے بھی اپنا مطلب مجھے سمجھانے میں ناکام رہتی تو جھنجھلا جاتی اور میرے ہاتھ نوچنے کی کوشش کرتی۔ پھر بھی جب میں نہیں سمجھ پاتا تو وہ مایوسی اور بے چارگی سے اپنا منہ پھیر لیتی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے بہنے

لگتے۔ ایسا لگتا کہ اس کے سینے میں گزری زندگی کی ناکامیوں اور ناتمام آرزوؤں کی ایک بھٹی سی سلگ رہی ہے اور زندگی کے اس آخری مرحلے میں وہ کسی سے اپنی کہانی کہہ کر اپنے من کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہے۔ قدرت نے اس سے اظہار کے تمام ذرائع چھین لیے تھے۔
ایک صبح جب میں اسے دیکھنے پہنچا تو اس کا کمرہ خالی تھا۔ بستر نہایت صفائی سے بنا تھا اور کمرے میں تازہ پھولوں کی مہک تھی۔ مجھے نرسنگ سپروائزر نے بتایا کہ وہ رات کو اس دنیا سے رُخصت ہوگئی ہے اور اب یہ کمرہ ایک نئے مریض کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا صندوق اس کی کل کائنات تھی جو میرے حصے میں آیا۔ اس میں چند کپڑے کچھ پرانی تصویریں اور ایک ڈائری تھی۔ رات کو گھر آ کر نیند سے کچھ دیر پہلے میں نے بستر پر لیٹ کر ڈائری کا صفحہ اُلٹا۔ اس نے لکھا تھا۔

جب گزری ہوئی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو سوچتی ہوں کہ کتنا وقت گزر گیا۔ اب تو زندگی کی شام ہے۔ اس تمام عرصے میں میں نے کیا کھویا اور کیا پایا اور یہ اتنا طویل سفر میں نے تنہا کیسے کاٹ لیا۔ شاید ماضی کو کریدنے سے اب کچھ فائدہ نہیں مگر مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے دل کے کسی تہہ خانے میں، اس کے کسی چھپے ہوئے تاریک گوشے میں اب بھی ایک آگ سی سلگ رہی ہے جس کی آنچ، جس کی تپش، رفتہ رفتہ میرے وجود کو راکھ کر دے گی۔

شاہد میں کبھی کبھی سوچتی ہوں کیا کبھی تمہیں بھی میرا خیال آتا ہوگا۔ زندگی کے اس مقام پر جب ہمارے درمیان ان گنت ماہ و سال کے فاصلے حائل ہو چکے ہیں اور ایک طویل عرصے سے ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی نہیں ہے کیا تم بھی گزرے لمحات کو سوچتے ہو گے؟ میرا بہت دل چاہتا ہے کہ اپنی زندگی کی کہانی لکھوں مگر پھر سوچتی ہوں کس کے لیے۔ لیکن پھر بھی سوچوں اور خیالات پر تو کوئی قید نہیں۔ میں اپنے من میں خیالوں کی ایک انجمن تو سجا سکتی ہوں اور ان گزرے ہوئے لمحات کو تصور کی آنکھ سے دیکھ تو سکتی ہوں جو میں نے تمہارے ساتھ گزارے تھے۔ میں تو تمہارے پیار میں تمہاری چاہت میں سرتا پا ڈوبی ہوئی تھی یا مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے چہار طرف محبت کی شبنم برس رہی ہے اور میں اس میں شرابور

ہو گئی ہوں مگر مجھے اس بات کا احساس بھی تھا اور خوف بھی کہ میں اتنی خوش قسمت نہیں کہ زندگی کے سفر میں تمہاری رفاقت کو پا سکوں۔ یوں سمجھو کہ میں تو اس دیوداسی کی مانند تھی جو اندھیری رات میں اپنے دیوتا کے قدموں میں دیا جلا کر چپ چاپ اُلٹے قدموں واپس ہو جاتی ہے اور اس کے دیوتا کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ وہ اس کے پیار میں دھیرے دھیرے سلگ رہی ہے۔

شاہد مجھے اچھی طرح یاد ہے جب تم اپنی امی کے ساتھ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے ہمارے یہاں آتے تو تمہاری شرارتیں، تمہارا چلبلا پن، تمہاری ذہانت اور سب سے بڑھ کر تمہاری دلچسپ باتیں سب ہی کو متوجہ کرتیں۔ مگر مجھے تو ایسا لگتا جیسے میرے چاروں طرف کسی نے جادو کا ایک حصار کھینچ دیا ہو۔ میں ٹکٹکی باندھ کر تمہیں تکتی رہتی اور تمہاری باتوں میں کھو سی جاتی۔ بچپن کے ان دنوں میں میری طرف کھینچا گیا وہ گھیرا کچھ ایسا تھا کہ میں اس میں زندگی بھر کے لیے قید ہو کر رہ گئی اور پھر کبھی اس سے باہر نہ نکل سکی۔

وقت آگے بڑھتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہارے لیے میری پسندیدگی محبت میں بدل گئی۔ میں ہر سال تمہارے آنے کا بے چینی سے انتظار کرتی اور تمہارے آنے پر میرے لیے دنیا کی ہر کشش، کائنات کی تمام تر خوبصورتی اور زندگی کی ہر دلچسپی صرف تمہاری ذات میں مرکوز ہو جاتی۔ اتفاق سے ہمارا ذوق بھی مشترک تھا۔ ہم گھنٹوں اُردو شاعری پر باتیں کرتے، اپنے پسندیدہ شاعروں اور ان کے کلام پر بحث کرتے یا کسی نئے شائع ہونے والے ناول پر تبصرہ کرتے۔ ایسے میں ہمارے تمام ہم عمر ساتھی اس خشک گفتگو سے تنگ آ کر ہم دونوں کو تنہا چھوڑ دیتے لیکن میں تمہارے بولنے کے انداز، تمہاری آنکھوں میں چمکنے والی ذہانت اور ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ کو محو ہو کر دیکھا کرتی اور ان میں کھو جاتی۔ ایسے میں جب بارش ہونے لگتی اور بارش کے قطرے قریب ہی رکھے گملوں میں لگے پام کے پتوں پر ٹپ ٹپ کی جلترنگ سی بجاتے تو فضا میں ایک دُھندسی چھانے لگتی اور میں خوابوں میں کھو جاتی۔ یہ جاگتی آنکھوں کے خواب تھے۔ مجھے ایسا لگتا کہ تم میرا ہاتھ تھامے مجھے رنگین دھنک

کی شاہراہ پر اُفق کے اس پار لے جا رہے ہو۔

اپنے انتہائی معمولی معاشی اور سماجی پس منظر کے باوجود یا شاید اسی کی وجہ سے تمہارے اندر ترقی کرنے کے جذبے کی ایک آگ دہک رہی تھی۔ تمہارے حوصلے بلند تھے اور تم اُونچی فضاؤں میں پرواز کرنا چاہتے تھے۔ تم نے صوبے بھر میں اول آ کر انجینئرنگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اب تم میں پختگی آ گئی تھی اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ تم کبھی کبھی خوش دلی سے مجھے اپنے ان خیالوں میں بھی شامل کرنے لگے تھے جن میں تمہارے مستقبل اور تمہارے ہونے والے جیون ساتھی کا تصور ہوتا۔ جب تم ایک خاص افسانوی انداز سے اپنے خیالی محبوب کا خاکہ میرے سامنے کھینچتے تو میں اندر سے لرز جاتی اور سوچتی کہ اللہ ان خوبیوں میں سے تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ تم جس طرح کے چہرے، آنکھوں، ہونٹوں اور رنگ روپ کا تذکرہ کرتے میں تو اس کا پرتو بھی نہ تھی۔ میری بدقسمتی تو یہ تھی کہ خدا نے مجھے ایک شفاف دل اور بیدار ذہن تو دیا تھا مگر میں ظاہری شکل وصورت میں بالکل عام بلکہ عام سے بھی کم تر لڑکیوں میں تھی۔ یوں تو ہم سب بہن بھائیوں کا رنگ سانولا تھا مگر میں تو کھل کر کالوں میں شمار ہوتی تھی۔ اس پر چھوٹے قد اور گھٹے ہوئے جسم نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ جب تم میرے سامنے بیٹھ کر لمبی لمبی مخروطی اُنگلیوں کا ذکر چھیڑتے تو میں اپنی چھوٹی چھوٹی گداز انگلیوں کو دیکھ کر جلدی سے انہیں ڈوپٹے میں چھپا لیتی۔ جب تم ایسی بادامی آنکھوں کا تذکرہ کرتے جن کی گھنی پلکوں کے اُٹھنے جھکنے سے صبح وشام کے اوقات مشروط ہوتے تو میں گھبرا کر اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے بارے میں سوچتی جو چشمے کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے اور زیادہ چھوٹی لگتی تھیں۔ مگر میری اُمیدیں اس لیے نہ ٹوٹنے پاتیں کہ تم کہتے تھے کہ شبو! زندگی ساتھ گزارنے کے لیے ذہنی یگانگت اور ذوق کا مشترک ہونا نہایت ضروری ہے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میری کسی بات یا کسی شعر کی تشریح پر تم کہتے شبو! واللہ تم جس انداز سے شاعر کے کلام کی روح کو سمجھتی ہو شاید ہی کوئی اور سمجھتا ہوگا۔ بھئی! تمہارے ساتھ تو گفتگو میں مزہ ہی آ جاتا ہے۔ میں تو تمہاری باتیں خاموشی سے سنا

کرتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محبت کے پھول تمہارے قدموں میں رکھتی جاتی۔

میرے سب بہن بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔تم نے بھی انجینئرنگ پاس کر لی تھی۔ میں بھی اپنا ایم اے کا سال ختم کر رہی تھی۔ایک رات جب آپی میکے آئی ہوئی تھیں تو انہوں نے مجھ سے کہا تھا تم کیوں شاہد کا انتظار کر رہی ہو؟ اس کے ذہن میں جو خاکہ ہے وہ تم نہیں ہو۔میں نے آپی کو ٹال دیا۔میرے اپنے ذہن میں بھی یہ وسوسے اُٹھتے تھے مگر پھر مجھے خیال آتا تھا کہ تم نے بارہا مجھ سے کہا ہے کہ ساتھی کے انتخاب میں تمہارے لیے سب سے اہم چیز خیالات کا مشترک ہونا ہے۔ایم اے پاس کرنے پر مجھے تحفہ دیتے ہوئے تم نے لکھا تھا شبو کے لیے جو مجھے مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔

شاہد! تمہیں نہیں معلوم تمہارے ایسے ہی الفاظ نے مجھے تمہاری محبت اور تمہاری پرستش کے ایسے بندھن میں باندھ دیا تھا کہ میں اگر چاہتی بھی تو اسے توڑ نہ سکتی تھی۔پھر اچانک ہر چیز الٹ پلٹ ہو گئی۔میں نے سنا کہ تمہارے لیے کسی حور اور اپسرا کی تلاش شروع ہو گئی ہے اور پھر ظلم یہ ہوا کہ اس کے بعد جب بھی تم ہمارے یہاں آتے تو یہ روداد مجھے بھی سناتے کہ کتنی لڑکیوں کو دیکھا، کیسی لڑکیوں کو دیکھا اور کس طرح انہیں رد کیا جا چکا ہے۔ایک اسکالر شپ پر تمہارا انگلینڈ جانا طے ہو چکا تھا۔ان دنوں اپنی کامیابیوں کے نشے میں چور تھے اور اتنے مغرور کہ ہر شخص تمہیں کمتر اور حقیر نظر آتا تھا۔میری تو جیسے ساری کائنات ہی متزلزل ہو گئی تھی۔

ایک دن تم آئے، میں پائیں باغ کے اسی گوشے میں فوارے کے پاس بیٹھی تھی جو تمہارا پسندیدہ گوشہ تھا۔پس منظر میں فوارے کا پانی جلترنگ سا بجا رہا تھا۔قریب ہی رات کی رانی کے پھول اپنے جوبن پر تھے اور فضا ایک ٹھنڈی اور میٹھی خوشبو سے بوجھل تھی۔تم نے بیٹھتے ہی کسی نئی کتاب کا ذکر چھیڑا لیکن میرا دل اس میں نہیں لگ رہا تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دل میں ایک آبلہ سا پڑ گیا ہو جو پھوٹنے کے لیے بے قرار ہو۔میں نے اپنا کپکپاتا ہوا ہاتھ تمہارے ہاتھ پر رکھ دیا اور تمہاری جانب ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوکھی

اور لڑکھڑائی زبان سے کہا شاہد! یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ کیا تم مجھے بھول گئے۔ کیا تمہیں میرے دل، میرے جذبات کا کوئی خیال نہیں؟

تم نے چونک کر میری طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ساکت ہو گئے۔ پھر مجھ سے کہنے لگے ارے شبو! مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ تم نے وہ سب کچھ سمجھ لیا جو میرا ہرگز بھی مطلب نہ تھا۔ مگر شبو میں تو ہر دفعہ کھل کر تم سے اپنے آئیڈیلز، اپنے مستقبل کے خواب شیئر کرتا رہا ہوں۔ میں سن سی ہو کر رہ گئی۔ تم سچ کہہ رہے تھے۔ تم نے کبھی بھی براہِ راست مجھ سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مگر شاہد کیا محبت کے اظہار کے لیے براہِ راست زبان سے کہنا ضروری ہے؟ کیا جذبات کی اپنی کوئی زبان نہیں ہوتی؟ کیا آنکھیں دل کی کہانی بیان نہیں کرتی؟ اب میں تمہیں کیا جواب دیتی۔ بھاگ کر اپنے کمرے میں آئی اور مسہری پر گر کر بلک بلک کر رونے لگی۔

اس کے بعد میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔ پھر سنا تم سمندر پار چلے گئے اور چار پانچ سال میں ایک دفعہ پاکستان آتے ہو۔ یہ بھی سنا کہ تمہارے لیے اب بھی اس لڑکی کی تلاش جاری ہے جو قدرت نے شاید بنائی ہی نہ تھی۔ اس وقت تک ہمارے گھروں میں اس قدر دوری ہو چکی تھی اور شاید تم اپنے آپ سے اس قدر شرمندہ تھے کہ پھر تم کبھی ہمارے یہاں ملنے بھی نہیں آئے۔ ادھر امی کی ضد کے باوجود میں نے ہمیشہ کے لیے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور محلّہ کے ایک اسکول میں ٹیچر ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی بے کیف زندگی سے مکمل سمجھوتا کر لیا تھا۔

مگر قدرت کو شاید ابھی میری آخری آزمائش منظور تھی۔ ایک دن سکول سے گھر واپس آئی تو دیکھا کہ کئی سال بعد تمہاری امی آئی ہوئی ہیں۔ وہ مجھ سے بڑے پیار سے ملیں۔ امی بھی میری طرف پیار سے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد امی نے کہا شبو! کے کام بھی نرالے ہوتے ہیں۔ شاہد کی امی تمہارے لیے شاہد کا رشتہ لے کر آئی تھیں۔ یعنی گزشتہ پندرہ سال میں اپنی تلاش سے مایوس ہو کر اور زندگی کے اس مقام پر کہ جب تم کسی کو

پسند کر بھی لیتے ہو تو تمہاری ادھیڑ عمر کی وجہ سے لڑکی والے تمہیں رد کر دیتے ہیں، تم میری جانب پلٹے ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے وقت نے، تم نے میرے منہ پر طمانچہ مارا ہے۔ جیسے میری عزت نفس کا گھروندا جسے میں نے دنیا سے بچا بچا کر رکھا تھا تم نے ایک ہی ٹھوکر میں اسے چکنا چور کر دیا ہو۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ میرا دل چاہا میں تمام کائنات کو جلا کر بھسم کر دوں۔ میں نے امی سے چیخ کر کہا امی......نہیں نہیں بس کریں۔ اب یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اپنی جان دے دوں گی مگر مجھے یہ قبول نہیں۔

بس پھر زندگی بے کیف راہوں پر کسی اُمید، کسی صبح کے انتظار کے بغیر گامزن ہوگئی۔ بڑے بھیا ایک عرصے سے امریکہ میں تھے۔ امی کے مرنے کے بعد انہوں نے ضد کر کے مجھے یہاں بلوا لیا۔ دراصل بھابی کام کرتی تھیں اور انہیں بچوں کی دیکھ بھال کے لیے کسی کی ضرورت تھی۔ بچے بڑے ہو کر جا چکے ہیں۔ بھابی بھیا کسی اور اسٹیٹ میں منتقل ہو گئے ہیں۔ بقول بھابی میں خوش قسمت ہوں کہ امریکی حکومت میری کفالت کر رہی ہے اور میں کسی کی محتاج نہیں۔ اس لیے سالوں سے ان سے بھی کوئی رابطہ نہیں۔ مگر میرے کشیدہ اعصاب کب تک میرا ساتھ دیں گے۔ میں حیران ہوں کہ ابھی تک سلامت ہوں مگر میری روح جل کر راکھ ہو چکی ہے اور کسی بھی لمحے یہ جسم بھی راکھ ہی کی طرح ڈھیر ہو جائے گا۔ مگر اب بھی میں جب کبھی ڈوبتی اُبھرتی لہروں پر غروب ہوتے ہوئے سورج کو دیکھتی ہوں اور ماحول قرمزی ہو جاتا ہے تو بیتے ہوئے وقت کی بہت سی تصویریں پرچھائیوں کی طرح ذہن پر اُبھر آتی ہیں اور شاہد تم بھی یاد آتے ہو۔ کیونکہ تم ہی تو میری سوچوں کا مرکز اور میرا سرمایہ حیات تھے۔ پھر سوچتی ہوں تمہیں ٹھکرا کر کہیں میں نے غلطی تو نہیں کی؟ مگر دوسرے ہی لمحے اس خیال سے تسکین ہوتی ہے کہ زندگی میں خوشی تو نہ ملی مگر میں اپنی انا، اپنی عزت نفس کو تو بچا لائی۔

میں نے ڈائری بند کی۔ بہت رات ہو چکی تھی۔ میرے لیے دوسرا دن مشقت آمیز تھا۔ میں نے سرہانے رکھا ٹیبل لیمپ بجھایا اور سونے کے لیے کروٹ لے کر ذہن کو خالی کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ جانے کیوں بہت دیر تک اس رات مجھے نیند نہیں آئی۔

ڈاکٹر طارق جاوید، گوجرانوالہ

پانی پہ تیرتا کنول

یونانی دیومالا میں تھیس پی (Thespiae) کے شہر Boetia میں نارسیسس (Narcissus) نامی نوجوان اپنے حسن کی وجہ سے چار دانگ شہرت رکھتا تھا ۔نیمیسس (Nemesis) کو خبر ہوئی تو نارسیسس کے دِل میں اُس نے جھیل کی کشش سمو دی، جس کے پانی میں وہ خود اپنے عکس پر فدا ہو کر اس کی جانب لپکا، اور ڈوب گیا۔ تاہم جس جگہ بیٹھ کر اپنے عکس کو دیکھا تھا، وہاں نارسیسس یعنی گُلِ نرگس کھل اُٹھا۔ جی ہاں! حیرت انگیز مشابہت ہے نارسیسس اور ایم۔ زیڈ میں ۔گُلِ نرگس کے بجائے گُلِ نیلوفر یعنی کنول رکھ دیا جائے تو یہ وہی ''کائنات مُٹھی میں'' ہے، جو آب سے نکل کر جھیل کے کنارے دھوپ میں چمکتی سیپی کی صورت ہماری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔

نارسیسس کے دل میں تو نیمیسس نے جھیل کی کشش سمو دی، تاہم ایم۔ زیڈ کے دِل کی جھیل کو جوار بھاٹا سے آشنا کرنے والی اوّلین ہستی دل فریب ہونے کے علاوہ ستم ظریف بھی تھی، سو آنسوؤں کے نمکین پانی میں غرق ہونا کنول کا مقدّر ٹھہرا۔ یہ نمکین پانی بھیس بدل بدل کر کنول کے دائیں بائیں، اوپر نیچے رواں رہتا ہے۔ کنول بھی اب اس کی اتنی عادی ہو چکی ہے کہ اگر اس میں کمی واقع ہو جائے یا خشک ہو جائے تو یہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ اُٹھتی ہے۔

کنول ایم۔ زیڈ کی ذات کا استعارہ بھی ہے اور اس کے فن کی علامت بھی۔ اِس کی غزل کے پہلے مصرع کے پہلے لفظ سے جو لہریں اُبھرتی ہیں وہ مختلف دروبست میں ڈھلتے ڈھلتے آخرِ کار مقطع میں مرتکز ہو کر ایک نئی کائنات معرضِ وجود میں لے آتی ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اِس ''بلیک ہول'' نے اپنے وجود سے فاصلے پر موجود ستاروں،

سیّاروں اور کہکشاؤں کو کیسے نگل لیا! میں آپ کو خبر دار کرنا چاہتا ہوں کہ احتیاط کے ساتھ اِس کو دیکھیے گا کہ قریب سے گزرتے ہوئے آپ کے ستارے، سیّارے یا کہکشاں میں خم ضرور آئے گا اور اگر خدانخواستہ یہ خم یا پچک جانے کی کیفیت کچھ زیادہ بڑھ گئی تو یہ ''بلیک ہول'' آپ کے ستارے، سیّارے یا کہکشاں کو نگل جائے گا:

آب زاروں میں کھِلتے کنولؔ دیکھ کر
خاک ہونے لگا چاندنی کا فسوں

....

آئینہ خانوں سے آ کر کیا کنولؔ نے کہہ دیا
خوشبوئیں بولیں ہمیں تھوڑی سی مہلت چاہیے

....

آب کو دے کر کنولؔ کا پیرہن
موجِ ساگر کر دیا برفاب نے

....

خاک زاروں میں سیپی میں ڈھل کے کنولؔ
مُسکرانے لگے دُھوپ کی اوس میں

....

لے لِیا ہے کنولؔ نے خوشبو سے
آب میں راستہ محبت کا

....

آبجو خوشبوؤں کی بھٹکنے لگی
خواب کر کے کنولؔ کا جہانِ عطا

....

کسی سیپی کی ٹھوکر کو دیا ہے
کنولؔ نے آبیانہ خودکشی کا

....

آب میں جو کنولؔ پہ ہے کندہ
سطر میں نے ہی تھی لکھی شاید

کنولؔ مقطع کی اساس اگر چہ آب ہے، لیکن اس اس کی تشکیل میں خوشبو، خوشبو کے بانکپن، خوشبو کی آبجو، چاندنی کے فسوں، گلفام، مسکراہٹ، گلبن، سیپی کی ٹھوکر، گلاب، صدف اور برف باری کا بھی حصہ ہے۔ آب کے متعلق تو بیان ہو چکا، تاہم خوشبو کے بغیر کنولؔ مقطع کی جمالیات مکمل نہیں ہو پاتی۔ دراصل اس میں آب اور خوشبو ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ یہ خوشبو یاد، خواب، وصل کا بھیگا لمحہ، ہتھیلی پہ رکھا گلاب، آنکھ میں چمکتا ستارہ؛ مری نتھیاگلی اور سوات میں دو بدنوں پہ گرتی ہوئی برف ہے۔

کنولؔ کی غزل کا ایک رُخ خواب کی تباہی، وصل میں بھیگے لمحے کا چوبِ خشک میں ڈھلنے، مُٹّھی میں سُوکھے گلاب، بُجھے ہُوئے ستارے کے علاوہ برف کی چاندنی کا آبِ تاریک میں تبدیل ہو جانے کے نوحہ پر مشتمل ہے۔ اور اس کے ساتھ اگر وہ اشعار بھی شامل کر لیے جائیں، جن میں سماجی اِقدار کی تباہی کی داستان نفوذ کیے ہوئے ہے، تو بربادی کی کتھا مکمل ہو جاتی ہے:

میرا غم ہاتھ باندھے ہُوئے آ گیا
دل پہ لکھنے حکایت تری یاد کی

....

شام کے ڈھلے سائے رات چھا گئی پھر سے
خواب کے جزیروں سے خاک اُڑ رہی ہے پھر

....

تمہاری یاد کا موسم اُتر آیا ہے مغرب سے
تُمہاری ہی اشارت میں یہ جشنِ برف باری ہے

....

تمہاری خوشبوؤں کی چھاؤں چاہیے ہم کو
گلوں سے کہنے لگے آ کے آندھیوں کے بدن

....

ماہتاب ٹیلوں سے خاک اُڑ رہی ہے پھر
آفتاب گلیوں سے خاک اُڑ رہی ہے پھر

....

ہوا کا راستہ مسدود کر دو حکمِ شاہی ہے
گھٹن کی تیلیاں من میں بسانے کی اجازت ہے

....

فصلِ گل باغباں سے پوچھتی ہے
خشک کیسے ثمر ہُوئے میرے

....

زرد پتّوں کا دھواں اوڑھ کے نیلی چادر
بولا خوشبو سے گلابوں کا اگن ہے خالی

....

اپنا ایمان تاوان میں دے دیا
سر پٹکنے لگا چاندنی کا فسوں

....

دُور اک بج رہا ہے نقّارہ
زندگی کھو گئی مری شاید

آخری شعر فرد اور اس سے منسلک سماج کی موت کا اعلامیہ ہے۔ یہ انجام خواب نگر کی دیواریں گروی رکھ دینے ہی کی وجہ سے دیکھنا پڑ رہا ہے، تاہم دوسری سمت کنولؔ کی غزل میں تصویر کا رُخِ روشن بھی اپنی چھب دکھا رہا ہے۔ میں نے تصویر کی مثال اس لیے دی ہے کہ یہ ایک ہی وجود سے پھوٹتے تحیّرات ہیں۔ اسی دھرتی پہ آدم خور جنّوں اور حیات کُش بھوتوں کے مقابل ایسے روشن پیکر بھی ہیں، جنہیں بابِ وفا رقم کرنے والے قلم، جبر و ریا کی انا سے سرکشی کرنے والی چاندنی اور نفی سے اُبھرتے ثبات کی نوید اور بشارت قرار دیا جا سکتا ہے:

دہکتی آگ میں کندن ہوئے تو بول اُٹھے
یزیدِ وقت کے آگے یہ محنتوں کے بدن

....

چشمِ مشکیزہ میں چُھپا آئی
لے کے اِذنِ فرات مُٹھّی میں

....

صبر مجھ کو پکارتا ہی رہا
جبر کے سامنے میں نکلی تھی

....

یہ میرا عشق ہے جو کر رہا تلاوت تھا
سحاب رات میں لکھ لکھ کے اِسمِ نورانی

کنولؔ کی شاعری میں عہدِ حاضر کی ایسی باشعور عورت کا پورا وجود گونجتا ہے، جو پدر سری سماج اور اس کے مردوں کے ظالمانہ، جابرانہ، حریصانہ، مریضانہ، متعصّبانہ، مجنونانہ رویوں اور جلی و خفی ہتھکنڈوں کے خلاف نبرد آزما ہے۔

زیرِ نظر مجموعہ کے کچھ اشعار معنی کی اُونچی لو کی وجہ سے ادبی بزرگوں اور بزرگ نوجوانوں میں اس لیے پسند کیے جائیں گے کہ ان کی فنّی و معنوی تعمیم اُسی شعری روایت کی

امین ہے جو لاشعور اور تحت الشعور کے بجائے محض شعور کو چُھوتی ہے، تاہم میری گفتگو کا اصل محور وہ اشعار ہیں جن میں مذکورہ شعری روایت کے برعکس صورتِ حال ہے۔

کنولؔ کی شعری جمالیات کی تشکیل میں لفظوں ،ترکیبوں تشبیہوں،استعاوں ،علامتوں، تجریدوں اور آہنگوں کے ساتھ ساتھ ردیفوں نے بھی جادو جگایا ہے، اور یہ جادو کبھی چُپکے سے اور کبھی اعلانیہ ایسے سر چڑھ کر بولتا ہے کہ صدیوں سے جسم کے خاموش یا سوئے ہُوئے ذرّات رقص میں آجاتے ہیں۔ اس ضمن میں اُن غزلوں کا مطالعہ ضروری ہے ،جن کی ردیفیں درج ذیل ہیں:

''کردیا برفاب نے''، ''کے بدن''، ''لگا چاندنی کا فسوں''، ''میں نکلی تھی''، ''ہنسنے لگی''، ''بھی دیکھ لی''، ''مُٹھّی میں''، ''سُنی شاید''، ''لگے دھوپ کی اوس میں''، ''گلابوں سے''، ''کا ناطقہ بند''، ''کے دیئے رکھے ہیں''، ''خودکشی کا''، ''خدا خیر کرے''، ''ذرا سوچ لے، ذرا سوچ لے''، ''سے خاک اُڑ رہی ہے پھر''، ''گُنگ ہوئی''، ''سے کہہ دیا''، ''ہیں سانپ''، ''آیا ہے مغرب سے''، ''میں یہ جشنِ برف باری ہے''، ''ہے عطر بیزی''، ''کی اجازت ہے''۔

غزل کی عمارت کو گرنے سے بچانے کے لیے حالیؔ کی تجویز کردہ ترامیم میں سے ایک یہ بھی تھی کہ غیر مردّف غزلوں کو زیادہ سے زیادہ رواج دیا جائے۔ اس کے عقب میں معنی کی ترسیل میں حائل رکاوٹوں کو ہٹانے کا تصور کارفرما تھا۔لیکن کیا کِیا جائے کہ ہر عہد میں ایسی غزلیں تخلیق ہوتی رہیں، جن میں نئی یا طویل ردیفوں نے اعلیٰ سطح کے جمالیاتی پیکر تراشنے میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسری جانب یہ بھی ہُوا کہ لمبی لمبی ردیفوں والی غزلیں کو منجی پیڑھی کی طرح یوں ٹھونکا گیا کہ ہمسایوں کی نیندیں حرام ہوگئیں یا ردیفیں الگ بنا کر چوڑیوں کی طرح غزل کی بانہوں میں پہنا تو دی گئیں، تاہم ان سے لوہے کے کڑے آہنگ ہی نمودار ہوئے۔

کنولؔ کی لمبی ردیفوں والی بیشتر غزلیں اُسی جمالیاتی روایت سے جُڑی ہوئی ہیں جن میں شفق ،قوسِ قزح ،گلاب اور گلِ نیلوفر کے عکس یا کانچ کی چوڑیوں کے بجنے سے مدھر

آہنگ جنم لیتے ہیں۔دراصل یہ ایسا مجموعی عمل ہے جس میں کئی رنگ،خواب یا ماہتاب باہم دگر پیوست ہیں۔

کنولؔ کی شعری جمالیات کا گزشتہ یا ہم عصر شعری جمالیات سے موازنہ کیا جائے تو اس میں عمومی نوع کی ہم آہنگی تو ملے گی ،تاہم خصوصی لحاظ سے مطلق رنگ حاوی ہے۔کنولؔ کی یہ شعری جمالیا ت اپنے وجود و متعلقات سے تراشی گئی ہے ۔الفاظ ،تراکیب،تشبیہات،استعارات علامات ،تجریدات ،احساسات ،خیالات کنولؔ کے تخلیقی گرداب میں ڈ ُوب ڈُوب،اُبھراُبھر،ٹکراٹکرا ایک ہوکراس کی غزلوں کی بیرونی واندرونی ساختوں کو متشکل کرتے ہیں۔شاید یہی وجہ ہے کہ ان ساختوں میں معنی کئی رُوپ دھار کر تیرتے بھی ہیں اور جب قاری کے مختلف خیالات و جذبات سے تعامل ہوتا ہے تو دوجمع دو کا حاصل جمع پانچ،سات اور نو کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

دراصل کنولؔ کی غزل میں برفاب کا رنگ سے نکہتیں چُرا کے رنگِ اختر اور آب کو کنول کا پیرہن دے کر موجِ ساگر بنانے ،اندھیری رات کے صُور سے اُجالے کی نمو؛چاندنی کے فسوں کا پتھروں کے جگرکو پارا پارا کرنے؛حبسِ دم کے بطن سے ابرِ باراں کا ظہور؛صحراؤں کی خاک چھاننے سے من میں آنکھوں کی تخلیق؛نفی نفی سے ثبات کا مٹھّی میں مُسکرا اُٹھنا؛دھوپ کی اوس میں خوابوں کا پلنا اور بند مُٹھّی سے جگنوؤں کا اُڑ کے ظلمت کو پارا پارا کر جانا حقیقت،خیال اور فن کے پیچیدہ مراحل کا آئینہ دار ہے۔

خاک ہونے لگا چاندنی کا فسوں
مجھ پہ ہنسنے لگا چاندنی کا فسوں

....

آئینہ خانوں نے آ کر کیا کنولؔ سے کہہ دیا
خوشبوئیں بولیں ہمیں تھوڑی سی مدّت چاہیے

....

میں تو خود کو تھی ڈھونڈنے نکلی
آ گئی کائنات مُٹّھی میں
چشمِ مشکیزہ میں چُھپا آئی
لے کے اذنِ فرات مُٹّھی میں

....

اپنی ہی راکھ سے میں نے تھے نکالے گوہر
پتھروں کے لگے انبار خدا خیر کرے

....

خاک ہونے لگا چاندنی کا فسوں
مجھ پہ ہنسنے لگا چاندنی کا فسوں

....

جس کے رستے میں کہکشائیں ہیں
ظلمتوں کی ہو وہ گلی شاید

....

آئینہ خانے مجھ پہ آ برسے
خود کو پہچاننے میں نکلی تھی

منقولہ بالا اور زیرِ نظر مجموعہ کے کئی دیگر اشعار میں ایسے کلیدی لفظ آئے ہیں جو مروّجہ یا لغوی معنی سے ہٹ کر ہیں، جس کی بنا پر پہلی قرأت میں مروّجہ معنی اور ان سے منسلکہ تلازمات شعر کے ساتھ تضاد کی حالت میں آ جاتے ہیں، تاہم شعر قاری کا پیچھا نہیں چھوڑتا، حتّیٰ کہ اوّلین قرأت سے ہویدا معنی کو نئے یا برعکس معنی برطرف کر دیتے ہیں۔ بعض اشعار میں تو معنی کی برطرفی کا عمل کئی بار ہوتا ہے۔ علامتوں اور تجریدوں نے ان اشعار کی ساختوں کی تشکیل کی ہے۔ کنولؔ کے ذہن کی مخصوص سیّال حالتوں نے مصرعوں اور شعروں کو تراشا ہی اس ڈھب پر ہے کہ چھاگل اور پانی کی بیک وقت تخلیق ہوگئی۔

ایم زیڈ کنولؔ، لاہور

میری بُکّل دے وِچ چور

قصرِ فردوسِ بریں شاہ کی شاہی سے مِلا
جو مِلا مجھ کو وہ اجمیر کی ماہی سے مِلا (فہیم کاظمی)

ڈاکٹر فہیم کاظمی صاحبِ تصوف شاعر، ادیب اور دانشور ہیں۔ اقبالیات میں پی ایچ ڈی ہیں۔ نظم ہو یا نثر ان کا قلم معجز بیاں روحانیت کی گتھیاں اور راہِ سلوک کی شاہراہوں پر معرفت کی منازل طے کرتا نظر آتا ہے۔ نوجوانی اور شباب کے اس دور میں ایسی تصنیف کسی صوفی کا کام ہی ہوسکتا ہے۔ میں ڈاکٹر فہیم کو ایک صوفی ہی سمجھتی ہوں جن کا ہر پل، عبادت، ریاضت اور خدمتِ عامہ کے جذبے سے معمور سیادت کی منازل پر گامزن دکھائی دیتا ہے۔ وہ ایک حسبی، نسبی، سید زادہ ہے جو اپنے آباء کی روایتوں کا علم تھامے ہوئے ہے۔ زیرِ نظر کتاب ،سلطان الہند، بھی ان کی اپنے بزرگوں سے نسبت کے اعلان کے ساتھ ساتھ ان سے نیاز مندانہ وابستگی کا اظہار ہے۔

یہ کتاب اس انقلاب آفریں شخصیت کی سوانح ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جنہوں نے لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا۔ جن کی حیاتِ مبارکہ قرآن وسنت کا قابلِ رشک نمونہ تھی۔ جن کا لقب ہی غریب نواز ان کی غرباء ومساکین سے محبت کے سبب پڑا۔ ڈاکٹر فہیم کاظمی نے اس ہستی پر قلم اُٹھایا ہے جس کا شجرۂ نسب وسلسلۂ طریقت مولائے کائنات حضرت علیؑ سے ہوتا ہوا فخرِ موجودات، سرکارِ رسالت، خیر البشر، خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ سے جا ملتا ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر فہیم کاظمی ان الفاظ میں عُقدہ کُشائی کرتے ہیں۔

''مراۃ الانساب'' کے مطابق آپ کا شجرۂ نسب یوں ہے۔

''خواجہ معین الدین'' بن خواجہ غیاث الدین حسن'' بن خواجہ کمال الدین'' بن خواجہ احمد حسین'' بن خواجہ نجم الدین طاہر'' بن خواجہ عبدالعزیز'' بن خواجہ ادریس'' بن امام موسیٰ کاظمؑ بن امام جعفرِ صادقؑ، بن امام محمد باقرؑ '' بن سید الساجدین حضرت امام زین العابدینؑ'' بحضرت سید الشہداء سیدنا حضرت امام حسینؑ'' بن حضرت مولا مشکل کُشا شیرِ خدا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ۔

آپ کے فیضانِ کرم سے ہزاروں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔آپ کی عمر پندرہ برس ہوگی کہ آپ کے سر سے والدین کا شفیق سایہ اُٹھ گیا۔ والدِ مکرم خواجہ غیث الدین حسن سے وراثت میں آپکو ایک باغ ملا تھا۔ یہ باغ اُن کی ہستی کو بھی ایک چمنستان کی مہک دے گیا۔اس واقعے کا حوالہ اکٹر فہیم کاظمی دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''اسی باغ میں ایک روز آپ کی ملاقات حضرت خواجہ خضر علیہ السلام سے ہوئی۔آپ حضرت خواجہ خضر علیہ السلام سے نہایت خندہ پیشانی سے پیش آئے اور خلاق و عجز و انکساری کے ساتھ انگوروں کے خوشوں سے اُن کی خاطر تواضع فرمائی۔حضرت خواجہ خضر علیہ السلام کی نظرِ کیمیاء اثر نے آپ کی لوحِ جبیں سے ساری حقیقت پڑھ لی اور سمجھ گئے کہ یہ لڑکا جو آج انہیں پانی پلا رہا ہے اور انگوروں سے تواضع کر رہا ہے۔کل لوگوں کی روحانی تشنگی دور کرے گا۔ ہزاروں کو حیاتِ جاوداں کا ساغر پلائے گا۔ جو اس کے ہاتھ سے جام پیئے گا وہ عشق میں سرمست و سرشار ہو جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی زنبیل سے کنجارہ کا ایک ٹکڑا نکالا اور دانتوں سے چبا کر سرکار غریب نواز کے مُنہ میں رکھا۔ کھلی کھانا تھا کہ خواجہ غریب نواز کا قلبِ مبارک انوارِ الٰہی سے روشن ہو گیا۔ وہ علائقِ دنیا سے برگشتہ ہو گئے۔طلبِ مولا کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے، باغ و املاک سب کو محتاجوں میں تقسیم کیا اور مسافرت اختیار کر لی''

اللہ کی راہ میں سب کچھ لُٹانے کے بعد آپ نے تحصیلِ علم کے لئے خراسان کو خیر باد کہہ کر سمرقند بخارا کا رُخ کیا۔ جو اُس زمانے میں علوم وفنون کے اہم مراکز تصور کئے جاتے تھے۔ یہاں آپ نے علومِ ظاہری کی تعلیم حاصل کی اور پھر مرشد کی تلاش میں دربدری لی۔

یہ تلاش انہیں حضرت عثمان ہارونی کے قریب لے گئی۔ ڈاکٹر فہیم کاظمی اس روایت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

''مسلمانوں کا یہ دعا گو معین الدین چشتی بمقام بغداد شریف امام موسیٰ کاظم کے روضۂ اطہر سے متصل مسجد میں اپنے مرشد پاک حضرت خواجہ عثمان ہارونی ''قدس سرّہٗ'' کی دولتِ پابوسی سے مشرف ہوا، اُس وقت روئے زمین کے مشائخ کبار ان کی محفل میں حاضر تھے۔ جب اس درویش نے سرِ نیاز زمین پر رکھا، پیرو مرشد نے ارشاد فرمایا، دو رکعت نماز ادا کر۔ میں نے نماز ادا کی تو فرمایا۔ ''قِبلہ رُو بیٹھ''۔ میں بیٹھ گیا۔ پھر حُکم دیا ''سورہ بقر پڑھ'' میں نے پڑھی، فرمان ہوا ''اکیس بار درود شریف پڑھ'' میں نے پڑھا۔ پھر آپ کھڑے ہو گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر آسمان کی طرف منہ کیا اور فرمایا۔ آؤ تا کہ میں تمہیں خدا تک پہنچا دوں'' بعد ازاں قینچی لے کر دعا گو کے سر پر چلائی اور گلیمِ خاص عطا فرمائی۔ پھر ارشاد ہوا، ''بیٹھ جا'' میں بیٹھ گیا تو فرمایا، ''ہمارے خانوادے میں شبانہ روز کے مجاہدہ کا معمول ہے تو آج رات اور دن مشغول رہ''۔ یہ درویش بموجبِ فرمانِ عالی مشغول رہا۔ دوسرے دن جب حاضرِ خدمت ہوا تو اِرشاد فرمایا: زمین کی طرف دیکھ، میں نے دیکھا۔ پوچھا ''اب کہاں تک دِکھتا ہے؟ تحت الثریٰ تک''، میں نے دیکھا۔ فرمایا: ہزار بار سورہ اخلاص پڑھ۔'' میں نے پڑھی'' فرمایا'' پھر آسمان کی طرف دیکھ::، میں نے دیکھا۔ پوچھا ''اب کہاں تک دِکھتا ہے؟'' عرض کیا ''حجابِ عظمت تک'' فرمایا آنکھیں بند کر۔ میں نے بند کر لیں، فرمایا 'اب کہاں تک دِکھتا ہے؟ میں نے عرض کیا، ''اٹھارہ ہزار عالم'' بعد ازاں سامنے پڑی ہوئی ایک اینٹ اُٹھانے کا حُکم دیا۔ میں نے اینٹ اُٹھائی تو اُس کے نیچے اشرفیوں کا ڈھیر تھا۔ فرمایا: اسے لے جا کر فُقراء میں تقسیم کر دے۔ میں نے حُکم کی تعمیل کی۔ واپس لوٹ کر آیا تو اِرشاد ہوا چند روز ہماری صحبت میں گزارو: عرض کیا ''تابع فرمان ہوں'' (انیس الارواح)

ایک اور روایت کے مطابق حضرت عثمان ہارونی حضرت خواجہ معین الدین چشتی کو لے کر مکّہ معظّمہ حاضر ہوئے۔ طواف کے بعد آپ نے بلند آواز میں فرمایا۔ ''اِلٰہی! معین

الدین حاضر ہے۔ اپنے اِس عاجز بندے کو شرفِ قبولیت عطا فرما۔ جواب میں ندائے غیبی سُنائی دی ’’ہم نے اِسے قبول کیا۔ بے شک! یہ معین الدین ہے۔‘‘

سلوک کی منازل کے ساتھ ساتھ راستے کی مسافت طے کرتے ہوئے آپ اُس مقام پہ پہنچے جو راجھستان کی ریاست کا حصہ تھا۔ وہاں آپ کے فیوض و برکات اور روحانی کمالات سے جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ کرشمہ ہی کچھ ایسا تھا کہ انا ساگر کی خوبصورت جھیل ایک کوزے میں سما گئی، ہوا یوں کہ راجھستان کے شہر اجمیر میں ایک مصنوعی جھیل جو پرتھوی راج چوہان کے دادا انا جی چوہان نے تعمیر کرائی تھی۔ جس کا رقبہ ۱۳ کلومیٹر ہے اور اس کے وسط میں جزیرہ ہے جہاں کشتی سے پہنچا جا سکتا ہے۔۔ قریبی پہاڑی پر ایک سرکٹ ہاؤس ہے جو عہدِ برطانیہ میں سرکاری رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس جھیل کی مناسبت سے خواجہ غریب نواز کے کمالات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہا کہ ایک بار آپ نے ایک خادم کو پانی لانے کو کہا۔ جھیل پر راجپوت سپاہیوں کا قبضہ تھا انہوں نے خادم کو پانی لینے کی اجازت نہ دی۔ خادم نے خواجہ غریب نواز سے ساری صورتِ حال بیان کی۔ آپ نے فرمایا یہ میرا کوزہ لے جاؤ۔ سپاہیوں نے سوچا ایک کوزہ سے کیا فرق پڑے گا سو انہوں نے اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ تنبیہہ بھی کی کہ اس کے بعد پانی نہیں ملے گا۔ لیکن ہوا کیا سپاہیوں کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا کیونکہ ۱۳ کلومیٹر پر محیط انا ساگر ایک کوزے میں سما چکا تھا۔

جسے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ سے ،قطب المشائخ کا لقب عطا ہوا۔ آپ گلستانِ ولایت کے مہکتے پھول ہیں اور سلسلہ عالیہ چشتیہ کے جلیل القدر بزرگ ہیں، جن کی کوششوں سے انتہائی قلیل مدت میں اجمیر شریف اسلامی آبادی کا مرکز بن گیا اور ہندوستان میں حقانیت کا بول بالا ہوا۔ ڈاکٹر فہیم کاظمی اس راز سے پردہ اُٹھاتے ہوئے کہتے ہیں۔

’’آپ چونکہ ایک شخصیت ہی نہیں بلکہ اپنے عہد کے علمبردار تھے۔ اس اعتبار سے آپ کی روحانیت کا سِکّہ ہر دور میں رائج رہا اور ہزاروں اور لاکھوں افراد کے علاوہ جن میں

فرزندانِ توحید بھی شامل ہیں اور غیر مسلم بھی آپ کے مزار پر حاضری دینے آتے رہے۔ یہ ربط وضبط تا دمِ تحریر جاری ہے اور انشاء اللہ جاری وساری رہے گا۔ بنا بریں متعدد اولیائے کرام، سلاطین با اقبال، مشاہیرِ عالم اور کئی سیاسی شخصیتوں کے لئے آپ کا مزارِ پُر انوار توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔ اِن میں مشائخ پاک و ہندسرِ فہرست ہیں۔ خواجہ غریب نواز کی بارگاہ میں مشائخِ ہند میں سب سے پہلے حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر نے حاضری دی اور پھر بے شمار انعامات و برکات حاصل کیں۔ سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی کی تالیف وراحت الولوب میں جسے آپ کے ملفوظاتِ طیبات کا مجموعہ گردانا جاتا ہے، اس حاضری کا تذکرہ ملتا ہے۔ خواجہ فرید الدین گنج شکر فرماتے ہیں کہ میں کئی روز تک شیخ الاسلام خواجہ معین الدین چشتی کے مزار پر معتکف رہا،،

آپ آفتابِ طریقت بھی تھے اور ماہتابِ شریعت بھی، بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ آپ کے آستانے پر حاضر ہوکر آپ کی قدم بوسی کو سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ کبھی سلطان شہاب الدین غوری آپ کی قدم بوسی کے لئے آیا، کبھی سلطان التمش نے سرِ جبین کو جھکایا، اور یہ سلسلہ بعداز وصال بھی جاری رہا۔ کبھی سلطان محمود خلجی آپ کے روضہء انور پر فتح کی دعا مانگتا ہے تو فتح یاب ہوتا ہے، کبھی اکبر بادشاہ درگاہِ عالیہ میں اولاد کی درخواست پیش کرتا ہے تو بامراد لوٹتا ہے۔ کبھی جہانگیر اپنی شفایابی پر سرِ دربار آپ کا غلام ہو جاتا ہے۔ کبھی شہزادی حورالنساء، کبھی شہزادی جہاں آرا، کبھی شاہجہاں، آپ کے زارِ اقدس کی پابوسی کرتے رہے۔ اور تو اور شعراء بھی اس سعادت میں کسی سے پیچھے نہیں۔ نواب مُصطفیٰ خاں شیفتہ چار دن تک آستانۂ عالیہ گوشہ نشین رہے پھر اپنے سفرنامہ میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ داغ دہلوی جن دنوں والیٔ دکن کی طرف سے وظیفہ بند ہو جانے کے باعث عُسرت اور تنگدستی کے اسیر تھے اس در کے گدا بن کر حاضر ہوئے۔ اور پھر خواجہ کی دعاؤں سے آپ کا وظیفہ بحال ہوا۔ مولانا حسرت موہانی، نیز اور بھی کئی شخصیات حاضری کے چراغ جلاتی رہیں اور فیض کے لنگر سے سیراب ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر فہیم کاظمی نے جن شعراء کے منظوم تاثرات کا

ذکر کیا ہے اُن میں داغ دہلوی، علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، حضرت مولانا شاہ نیاز بریلوی، مضطر خیر آبادی، مہاراجہ سر کرشن پرشاد جیسی معتبر شخصیات کے حوالے ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

خواجۂ خواجگاں معین الدین
فخرِ کون و مکاں معین الدین
قربِ حق اے نیاز گر خواہی
سازِ دردِ زُباں معین الدین
(مولانا شاہ نیاز بریلوی)

نورِ حق کی ضیاء معین الدین
شمع بزمِ صفا معین الدین
کام حسرت کے سارے بن جائیں
ہو جو لُطف آپ کا معین الدین
(مولانا حسرت موہانی)

بے مانگے ہوئے ملتے ساغر کو یہیں دیکھا
ساقی سا سخن داتا ہم نے تو نہیں دیکھا
(مُضطر خیرآبادی)

مور چھل جھلنے کی خِدمت مِل گئی
شاہ کو دنیا میں عزت مِل گئی
بارگاہِ خواجۂ اجمیر سے
لو کلیدِ گنجِ قسمت مِل گئی
(مہاراجہ سرکشن پرشاد)

یا خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند غریب نواز
یا واقفِ رازِ خفی سلطان الہند غریب نواز
فریاد تمہیں سے ہے میری،تکلیف سہی کیسی کیسی
ہو داد طلب کی داد رسی سلطان الہند غریب نواز
لائی ہے مجھے امیدِ کرم اِس خاک اور اِس در کی ہے قسم
سب دور ہوں میرے رنج ولی سلطان الہند غریب نواز
یہ داغ کہاں تک رنج سہے تم سے نہ کہے تو کس سے کہیں
تم آلِ نبی ﷺ،اولادِ علیؑ، سلطان الہند غریب نواز
(داغ دہلوی)

ہے جو خواجہ کی زیارت کا تصور اے ظفؔر
آ بسی گویا مری اجمیر آنکھوں تلے
(بہادر شاہ ظفؔر)

سلطنتِ مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر جو کہتے تھے۔''نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں ،نہ کسی کے دل کا سرور ہوں''

''سچ تو یہ ہے خود اُن کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور خواجہ غریب نواز کی محبت کی آماجگاہ تھا۔اُس وقت سے لے کر آج تک ہندوستان کے سارے حکمران بلا امتیاز عقیدہ و مسلک،اس آستانہء عالیہ پر سر جھکاتے آئے ہیں۔آپ کے وسیلے اور قدومِ میمنت لزوم کے صدقے سرزمینِ ہند رشکِ آسمان بنی۔روایات میں آتا ہے کہ جس وقت آپ کا وصال ہوا آپ کی پیشانی مبارکہ پر نورانی خط میں تحریر تھا۔ماتَ حبیب اللہ، فی حُبّ اللہ یعنی اللہ کا دوست اللہ کی محبت میں وصال پا گیا۔آپ کا مزارِ پُر انوار جمیر شریف (انڈیا) میں مرجع خلائق ہے۔آپ کے مزار پر مسلمان ہی نہیں ہندو،سکھ،عیسائی،اور دیگر مذاہب کے لوگ عقیدتوں کے پھول نچھاور کرنے تشریف لاتے ہیں۔درگاہِ عالیہ آج بھی ایمان ویقین اور

علم ومعرفت کے نور برساتی ہے۔آپ کا عرس مبارک ہر سال نہ صرف اجمیر شریف بلکہ پورے پاک وہند میں عقیدت واحترام سے منایا جاتا ہے۔

حضرت معین الدین چشتی اجمیری کی انقلاب آفریں شخصیت ہندوستان کی تاریخ میں ایک نہایت ہی زریں باب کی حیثیت رکھتی ہے۔آپ کے دور میں جہاں ایک طرف آپ کی توجہ اور تبلیغی مساعی سے ظلمت کدہ ہند میں شمع اسلام کی روشنی پھیل رہی تھی ، دلوں کی تاریکیاں ایمان وایقان کی روشنی سے جگمگا رہی تھیں ،لوگ جوق در جوق حلقہء اسلام میں داخل ہو رہے تھے۔تو دوسری طرف ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی غلبہ بھی بڑھ رہا تھا۔آپ کے عقیدت مندوں اور مریدوں میں شامل سلطان شہاب الدین غوری، اوران کے بعد قطب الدین ایبک اور سلطان التمش ایسے بالغ نظر، بلند ہمت اور عادل حکمران سیاسی اقتدار کو مستحکم کر رہے تھے۔حضرت معین الدین چشتی رحمتاللہ علیہ نے تبلیغِ اسلام، احیائے دین وملت، نفاذِ شریعت اور تزکیہ قلوب واذہان کا اہم ترین فریضہ جس موئثر انداز میں انجام دیا وہ اسلامی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔

تاریخ ، اسلام میں بار ہا ایسے مواقع نظر سے گزرتے ہیں جس میں اسلام کے کلچر کو مِٹانے کی کوششیں کی گئی لیکن وہ مغلوب نہ ہوسکا کیونکہ ٹھیک اُسی دم صوفیا کا گروہ اس کی مدد کو آجاتا، اوراپنے اندازِ فکر سے اس تنِ بیمار کو نئی توانائی اورقوت بخش دیتا تھا کہ ساری طاقتیں اس کے سامنے عاجز آجاتیں۔ڈاکٹر فہیم کاظمی نے اس تالیف میں حضرت سلطان الہند اجمیری کی سوانح کا احاطہ کرتے کرتے ساری تاریخِ تصوف کو کھنگال ڈالا ہے اور یہ باور کرایا ہے کہ ایسی ہی شخصیات ہیں جو اسلامی معاشرے میں انسانی اقدار کے خوگر، مذہبی انتہا پسندی کے مخالف، انسان کی قدر ومنزلت پر یقین رکھنے والے، ہر قسم کے تعصّبات سے پاک، کسی شجرِ سایہ دار کی طرح مخلوقِ خدا کو حوصلہ، ہمت اور روشنی دینے والے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں، جن کی دمکتی پیشانیوں پر محروم ومجبور انسانوں کیلئے کیسی کیسی بشارتیں رقم ہیں، ان کے لہجوں میں سچائی اور امان کے کیسے درس ہوتے ہیں۔ان کے عمل میں کیسی دلپذیری ہوتی

ہے کہ لوگ ان کی طرف کھچے چلے آتے ہیں۔ اوران کے دامنِ عافیت میں پناہ لیتے ہیں۔

جرمن ماہرِ عمرانیات پروفیسر یورگن وسیم فریمبگنن نے گوئٹے انسٹیٹیوٹ کراچی میں اپنی کتاب کی رونمائی کے موقع پر حاضرین کو یہ نکتہ یاددلایا کہ پاکستان کی صوفی روایات میں دہشت گردی کے خاتمے کے لئے سب کچھ ہے مگر سے بھلا دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ رواداری اس خطے کی روایات میں شامل ہے۔ مزید یہ کہا کہ تصوف معاشرے میں بڑھتے ہوئے عدم تشدد کا توڑ ہے۔ اس کی تعلیمات میں عدم تشدد اور بھائی چارے کے خیالات شامل ہیں۔ اور یہ خیالات ہی انسان اورانسان کے بنائے ہوئے معاشروں کوامن اورسکون کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کل ہند خلافت کانفرنس کے موقع پر بلکہ ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔

''لوگ اگر سچے جذبے کے ساتھ خواجہ صاحب کے دربار میں آجائیں تو آج بھی اُن کے باطن کی بہت سی خرابیاں ہمیشہ کے لئے ناپید ہوسکتی ہیں۔''

مشہور انگریز وائسرائے لارڈ کرزن نے ۱۹۰۲ میں دارالخیر اجمیر میں حضرت خواجہ کی بارگاہ میں حاضری کے وقت وفورِ جذبات میں آکر اِحقیقت کی طرف اِن الفاظ میں بلیغ اِشارہ کیا تھا کہ

''میں نے ایک قبر (خواجہ غریب نواز) کو ہندوستان میں بادشاہت کرتے دیکھا ہے۔''

شہر اجمیر بھی ہے ہند میں آپ اپنی نظیر
تاجِ شاہی سے مرقع ہے یہاں قبرِ فقیر

ڈاکٹر فہیم کاظمی نے ایسے ولی اللہ کے فضائل لکھنے پر قلم اٹھایا ہے جو آج وقت کی ضرورت بھی ہے اور تقاضا بھی ہے۔ سیدزادے نے سلسلۂ چشت سے وابستگی کا حق ادا کر دیا ہے۔ آج جبکہ عزتوں کے آبگینے چور چور ہورہے ہیں۔ دہشت گردی کے آسیب نے دلوں کا سکون پارہ پارہ کر رکھا ہے۔ وحشتوں کے دیو نے اپنی عفریت سے دلوں کا سکون لوٹ رکھا ہے۔ ایسے میں آپ نے قوم کو یاد کرایا ہے کہ اس بدامنی اور معاشی و معاشرتی

ابتری سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ ان اولیا اللہ کی تقلید کا راستہ، جنہوں نے برصغیر کے لوگوں کو اس وقت بھی پناہ دی تھی جب اُن کے لئے کوئی جائے پناہ نہ تھی، آج بھی ان کی تعلیمات پیامِ الفت و اخوت دے کر سب کو ایک لڑی میں پرونے کی ترغیب دے رہی ہیں۔ سید زادے ڈاکٹر فہیم نے سلوک کی یہ منزلیں طے کرتے ہوئے اپنے جدّ امجد کے دامن میں نہ صرف خود پناہ لی ہے بلکہ خلائقِ عامہ کو بھی اس مشکل سے نپٹنے کا گُر بتا دیا ہے۔ تصوف تو اللہ ھُو ہے اور اس ھُو کی قدرت میں کائنات رقص کرتی ہے۔ ارض و سماء وجد میں انا الحق، انا الحق کی کیفیت سے گزرتے ہیں تو منصور پیدا ہوتا ہے۔ ایسے ہی کسی لمحے میں بُلھے شاہ چپکے سے اس راز کو آشکار کر دیتے ہیں۔ میری بکل دے وچ چور

یہی لمحہ ہے جو انسان کو سجدہ بے نیاز میں خدا سے جا ملاتا ہے جو کہ انسان کے اشک کو قطرۂ انفعال بنا کر سیپ میں موتی بنا دیتا ہے۔ ایسے ہی وارفتگی کے لمحوں میں ڈاکٹر فہیم نے غواصِ عشق سے گوہر چنے تو وہ سلطان الہند کے قالب میں ڈھل کے گوہرِ ادب کا نکھار بن گئے۔

اور اسی پر موقوف نہیں بلکہ ان تجلیوں کے جلو میں سید زادے کی یہ کاوش ایک ادبی و تحقیقی شہ پارہ ہی نہیں، عقیدتوں کا دبستان بن گئی۔ وہ خود کہتے ہیں۔

معین الدین نے مجھ کو بھی آگہی بخشی
کمالِ لُطف سے ذرّے کو روشنی بخشی
سکونِ قلب دیا روح کو خوشی بخشی
کلام کو مِرے پھولوں کی تازگی بخشی
زُباں کے تار سے لعل و گُہر پروتا ہوں
وِلا کے ہار میں شمس و قمر پروتا ہوں

پروردگار ان کی اس ریاضت کو قبول فرما کر ان کے لئے صدقہ جاریہ اور توشۂ آخرت بنا کر دنیا و آخرت کی منزلوں کو آسان بنا کر کامیابیوں اور کامرانیوں کو ان کا نصیب بنا دے۔

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، دہلی انڈیا



جگنو انٹرنیشنل ہے علم و دانش کی امین
کرتی ہے ہموار جو فکری تناظر کی زمین

ہے یہ اقصائے جہاں میں اردو کی خدمت گزار
اس کے اغراض و مقاصد ہیں نہایت دلنشین

خواب کے ایم زیڈ کنولؔ کے خوشنما تعبیر ہے
کیوں نہ ہوں مداح اس کے فکروفن کے شائقین

اک مجلّہ بھی ہے اس کے نخلِ دانش کا ثمر
ہے ادب کے ساتھ عصری آگہی کا جو امین

اس میں ہے عصری تقاضوں کا بخوبی التزام
ہے یہ معیاری ادب کا اک رسالہ بہترین

جس کے ہے زیرِ اِدارت یہ رسالہ معتبر
عہدِ حاضر کی ہیں وہ اِک شاعرہ بیحد ذہین

ہر کسی کے اس میں ادبی ذوق کا سامان ہے
بہرہ ور ہوں گے جہاں میں اس سے برقیؔ ناظرین

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، دہلی انڈیا



شاعر خوش فکر و خوش گفتار ہیں ایم زیڈ کنول
اہل دانش کی معین و یار ہیں ایم زیڈ کنول

ان کو نظم و نثر پر حاصل ہے یکساں دسترس
مرجع اہلِ نظر فنکار ہیں ایم زیڈ کنول

ہے صحافت سے بھی ان کو ایک دیرینہ لگاؤ
ترجمان کوچہ و بازار ہیں ایم زیڈ کنول

ہیں عیاں اسلوب سے اس کے ادب کی چاشنی
جس صحافت کی علمبردار ہیں ایم زیڈ کنول

جگنو انٹرنیشنل بھی ان کی ہے ورد زباں
جس سے برقی سرخیِ اخبار ہیں ایم زیڈ کنول

....

خوب ہے ایم زیڈ کنولؔ کی شاعری
ہے نمایاں جس سے عصری آگہی
ہیں یہ گُلہائے سُخن بیحد حسیں
اس میں ہے فِکر و نظر کی دِلکشی

ایم زیڈ کنولؔ، لاہور



آج بولا یہ نا خُدا مُجھ سے
عدل ہوتا نہیں روا مجھ سے

میں تو صرصر کو سانس میں بھرلُوں
بارِ خاطر ہے یہ صبا مجھ سے

رتجگے کی صلیب لٹکی رہی
خواب کا کھو گیا سِرا مجھ سے

درد پہلو میں آ کے بیٹھ گیا
چھین کر یاد کی رِدا مجھ سے

آگہی کی کتاب ہنسنے لگی
جہل کو دیکھ کر خفا مُجھ سے

کھیلنے کو مِلا تھا چاند اُسے
پھر بھی کہتا ہے کم مِلا مُجھ سے

پتھروں کا بدن سُلگنے لگا
جب بھی ہیرے نے کچھ کہا مجھ سے

چشمِ عریاں لہو میں ڈوبی ہوئی
دل کا کرنے لگی گِلہ مجھ سے

کہہ دیا ہے کنولؔ نے خوشبو سے
آب زاروں نے جو کہا مُجھ سے



پھر آیئنے سے چھِڑ گئی خوابوں کی گفتگو
صبر و شکیب چھین کے یادوں کی گفتگو

دل کے صحیفے دل سے ملاقات کے لئے
سانسوں میں بھر کے لائے گلابوں کی گفتگو

پیروں کی بیڑیوں نے چھپا کر حناؤں سے
لکھی ہتھیلیوں پہ مرادوں کی گفتگو

صحنِ چمن بھی رونے لگا ہائے زار زار
خاروں سے آ ملی جو بہاروں کی گفتگو

تارو ں کا قافلہ چلا میری انا کے ساتھ
کی روشنی نے بجھتے چراغوں کی گفتگو

سنگ زار آ گئے مُجھے بیدار دیکھ کر
کرنے کو رتجگوں سے عذابوں کی گفتگو

پھر دھوپ کی شفق مرے آنگن میں آ گی
ابرِ کرم کو دے کے سحابوں کی گفتگو

چشم کنولؔ نے لکھی ہے خاک شفا کے ساتھ
کرب و بلا میں بکھرے گلابوں کی گفتگو

فیروز ناطق خسرو، کراچی



رُلتے ہوئے مٹی میں گہر دیکھ رہے ہیں
سب اہلِ قلم ، اہلِ نظر دیکھ رہے ہیں
طوفان تھما ہے تو بڑے دکھ سے پرندے
خود اپنے ہی ٹوٹے ہوے پر دیکھ رہے ہیں
ہر گام پہ رہزن ہیں ہر اک موڑ لٹیرے
لٹتے ہوئے ہر بندہ بشر دیکھ رہے ہیں
لے ڈوبی ہمیں موسمِ سرما کی یہ بارش
ڈوبے ہوئے، گرتے ہوئے گھر دیکھ رہے ہیں
بچوں پہ سے ہٹتی نہیں ماں باپ کی نظریں
تسکینِ دل و جان و جگر دیکھ رہے ہیں
بے بس ہیں مری طرح مرے شہر کے باسی
جلتے ہوئے خوابوں کا نگر دیکھ رہے ہیں
وہ لوگ جو تقدیر کی لہروں سے ہیں خائف
بنتے ہوئے پانی میں بھنور دیکھ رہے ہیں
جو اپنے ہی ہاتھوں سے بناتے ہیں مقدر
وہ گہرے سمندر میں گہر دیکھ رہے ہیں
جو سر کبھی جھکتا نہیں، سجدے کے علاوہ
اب تک سرِ نیزہ وہی سر دیکھ رہے ہیں
وہ وقتِ سفر ہم سے نظر لاکھ چرائیں
ہم ان کی نظر وقتِ سفر دیکھ رہے ہیں
کام آ گئیں خسرو درِ زنداں یہ دعائیں
دیوار میں بنتا ہوا در دیکھ رہے ہیں

اکرم کنجاہی، کراچی



کیسے کہوں کہ تجھ پہ بھروسہ نہیں رہا
جیسا کبھی تھا یار تو ویسا نہیں رہا

ذرّوں کو ایسی پیاس تھی اُس دشتِ ہجر میں
جو ایک نزدِ دشت تھا دریا نہیں رہا

شیشم کا ہائے پیڑ گلی میں تھا کٹ گیا
ہائے وہ نیم باز دریچہ نہیں رہا

شکوہ کناں ہوں میں بھی، شکایت بہ لب ہے تُو
ہر شخص جیسا پہلے تھا ویسا نہیں رہا

بازارِ جنس داد طلب ہے ترا ہنوز
ہم کیا کریں کہ ذوقِ تماشا نہیں رہا

بٹی ! وہ لے گیا ہے تجھے جو بھی تھا عزیز
اُس گھر نہ جا کہ اب ترا بابا نہیں رہا

کیا، شاخ شاخ آئی نہ کونپل نئی نئی
کیا پھول پھول ڈال سے جھڑتا نہیں رہا

ہر کہکشاں بھی ساتھ تمہارے چلی گئی
دل میں چراغ ایک بھی جلتا نہیں رہا

سہیل احمد صدیقی، کراچی



سوچتا ہوں ، عذاب کیا ہوگا
روزِ محشر حساب کیا ہوگا

شہر و صحرا میں خوب جل تھل ہے
ظالموں پر عتاب کیا ہوگا

فصلِ گل میں وصال کی خواہش
ہائے مفلس کا خواب کیا ہوگا

دل شکستہ ہیں، لب ہیں پژمردہ
اُس کے رخ پہ شباب کیا ہوگا

نیکیاں کرکے بھول جاتا ہے
اس کا اجر و ثواب کیا ہوگا

کب سہیلِ حزیں ہو آسودہ
پوچھتا ہے ، جواب کیا ہوگا

اک سانس کی طناب جو ٹوٹی تو اے شکیبؔ
دوڑے ہیں لوگ جسم کے خیمے کو تھامنے
(شکیب جلالی)

طارق تاسی، لاہور



درد کا چارہ کر سکتے تھے، لیکن بس
عشق دوبارہ کر سکتے تھے، لیکن بس

منتر پڑھ کر میرے ہاتھ کے جگنو کو
چاند ستارہ کر سکتے تھے، لیکن بس

تِل تِل مرتے دیکھا، گرچہ پل بھر میں
پارا پارا کر سکتے تھے، لیکن بس

ایک زرا سی زحمت کر کے فرقت کا
سرد شرارا کر سکتے تھے، لیکن بس

دو پل چین سے ان کے پاس بِتا لیتے
ایک اشارہ کر سکتے تھے ، لیکن بس

وقت کے ساگر کی زہریلی موجوں کو
امرت دھارا کر سکتے تھے، لیکن بس

دھوپ سے پہلے جلدی جا کر اے تاسی
کام یہ سارا کر سکتے تھے، لیکن بس

بشریٰ فرخ، پشاور



اُسی درگاہ پہ منّت نئی مانی جائے
اب کہاں اور محبت یہ پرانی جائے

ایک افسانہ کبھی ایسا بھی لکھے کوئی
آگے کردار چلیں ,پیچھے کہانی جائے

کوئی دھونی, کوئی منتر, کوئی تعویز ہی ہو
دلِ بیمار سے یادوں کی نشانی جائے

جب کبھی اپنا کوئی مدِ مقابل آئے
دل کی رگ رگ میں غمِ ایذا رسانی جائے

گفتگو ایسی کہ ابہام نہ ہو لہجے میں
لفظ کے سائے تلے خود ہی روانی جائے

سب خساروں کو جمع کر کے یہ حاصل نکلا
دلِ ناداں کی کوئی بات نہ مانی جائے

ختم ہوتا ہی نہیں چشمِ عزادار کا سوگ
کس سمندر میں یہ دریا کی روانی جائے

منتقل اس کو کیا جائے یہاں سے بشریٰ
دل سے یہ درد کی بد روح پرانی جائے

شگفتہ غزل ہاشمی، لاہور



کوئی بھی بات ہو ہم اس کے دل کی جان لیتے ہیں
کرے اظہار خود لب سے یہ کب احسان لیتے ہیں

میں اس کی ذات میں پوشیدہ ھوں وہ مجھ میں ہے مخفی
چلو اچھا حقیقت ہے یہی تو مان لیتے ہیں

کٹھن رستوں پہ چلنے والے پا لیتے ہیں منزل کو
وہ اکثر ٹوٹ جاتے ھیں جو رہ آسان لیتے ہیں

کہانی بے مزہ بھی ہو تو یہ فن ہے مصنف کا
وہ اس کا خوبصورت سا کوئی عنوان لیتے ہیں

سنا ھے عزمِ راسخ سے پگھل جاتا ھے پتھر بھی
اب اس پتھر کو پگھلائیں گے دل میں ٹھان لیتے ہیں

وہ مجھ کو چھین لینا چاھتا ھے خود مجھی سے ہی
غزل جو دیوتا ہوتے ہیں بھاری دان لیتے ہیں

زندگی تُو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے
(بشیر بدر)

گل بخشالوی، کھاریاں



میں اپنے درد کی تفسیر بن کر لکھ رہا ہوں
سسکتے خواب کی تعبیر بن کر لکھ رہا ہوں

میں زندانی ہوں تم مجھ سے مری حالت نہ پوچھو
سراپا سوزشِ زنجیر بن کر لکھ رہا ہوں

ہوا جب زلزلے سے منہدم قصرِ تمنا
میں اُس کی حسرتِ تعمیر بن کر لکھ رہا ہوں

مجھے میری محبت کا صلہ کیا مل رہا ہے
میں اک بے درد کی تصویر بن کر لکھ رہا ہوں

مرے خاموش ہونٹوں پر ہزاروں ہیں فسانے
کسی گونگے کی میں تحریر بن کر لکھ رہا ہوں

بظاہر خار ہوں لیکن حیاتِ جاوداں کا
مہکتا پھول ہوں کشمیر بن کر لکھ رہا ہوں

میں مستقبل کا بھی کاتب ہوں دلوں کا ترجماں بھی
گلؔ ہر انسان کی تقدیر بن کر لکھ رہا ہوں



ہتھیلی پر لیے سر اپنا چلتے جا رہے ہیں
لہو سے خواب کی تعبیر لکھتے جا رہے ہیں

لگی تو آگ ہے دل میں مگر غربت کے مارے
امیرِ شہر کے سانچے میں ڈھلتے جا رہے ہیں

پریشانی مری دہلیز پر آ کر کھڑی ہے
لباسِ عید کو بچے مچلتے جا رہے ہیں

کہیں پر زلزلے، طوفان، پانی اور ہوائیں
خدا جانے یہ نقشے کیوں بدلتے جا رہے ہیں

مرے دل کے جہاں میں خشک سالی کا سماں ہے
کئی ارمان تھے سارے سلگتے جا رہے ہیں

نہیں کچھ غم مجھے اپنے پاگلؔ حاسدوں کا
حسد کی آگ میں وہ خود ہی جلتے جا رہے ہیں

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے
(فیض احمد فیضؔ)

ارحم روحان، لاہور



تعلق اِک ہمارا تھا اگر کچھ یاد آئے تو
چمکتا اِک ستارا تھا اگر کچھ یاد آئے تو

تعلق اور ستارے دونوں اکثر ٹوٹ جاتے ہیں
ستارا دل ہمارا تھااگر کچھ یاد آئے تو

کیا تھا عہد ہم اگلے کنارے تک رہیں گے ساتھ
سمندر کا کنارا تھااگر کچھ یاد آئے تو

کہا موسیٰ سے اللہ نے تمہاری ماں نہیں باقی
دعاؤں کا سہاراتھااگر کچھ یاد آئے تو

کبھی جو یاد آؤں تو بس اتنا یاد کر لینا
کوئی ارحم تمہارا تھا اگر کچھ یاد آئے تو

زندگی تُو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے
بشیر بدر

شیراز انجم، لاہور



جانتا ہے کوئی کیا سے کیا ہو گیا
پھر مرے ساتھ اک حادثہ ہو گیا

دیر تک تو میں ڈوبا رہا خواب میں
پھر ہوا یوں وہ مجھ سے جدا ہو گیا

دھڑکنیں خط کی صورت وہاں تک گئیں
دل کا شاید وہاں رابطہ ہو گیا

ان کی ہے دسترس منزل , عشق تک
مجھ سے یہ بھی تو ان کا بھلا ہو گیا

ان کی یادوں نے ایسا ہے بے خود کیا
دل نہیں یہ کوئی میکدہ ہو گیا

گُل کے آنسو جو دیکھے کہا خار نے
تو بھی اب درد سے آشنا ہو گیا

بن ترے جی نہ پائے گا انجم یہاں
تو مرے واسطے اک نشہ ہو گیا

عبدالرزاق بےکل، آزاد کشمیر



یاد آتے ہو تو کیوں یُونہی مسلسل جاناں
آج سینے میں مِرے اور ہے ہلچل جاناں

ایک مُدّت سے یہ دِل تھا جو حوالے تیرے
تنگ کرتا ہے اِدھر آ کے وہ پاگل جاناں

کاش تُو ہی مجھے آ کر یہ بتا دے اک دن
عِشق ہوتا ہے تو کس طرح مکمّل جاناں

حُسن کے ساتھ کبھی ہو گی وفا بھی شامل
پُوچھتے ہیں وہ ستارے یہی پل پل جاناں

ابرِ رحمت میں بھی پوشیدہ رہی برقِ تپاں
آج برسات میں ج?لتا رہا جنگل جاناں

دل کے شیشے پہ اگر چوٹ سی لگ جائےکہیں
خُود نِکل آتے ہیں انسان کے کس بل جاناں

ہاتھ باندھے جسے کرتے تھے مہ و مہر سلام
خاک ہے تُجھ سے بِچھڑ کر وہی بےکل جاناں

رضوان ہاشمی رضی، لاہور



کبھی کچھ کہنا اور کچھ سنتے رہنا اچھا لگتا ہے
کبھی پڑھنا ہمیں غم کا فسانہ اچھا لگتا ہے

نرالا رنگ ہی سب کا یہاں ہے بات کرنے کا
ہمیں تو اس لئے چپ چپ ہی رہنا اچھا لگتا ہے

ہمیں عادت نہیں گرچہ کسی کو اپنا کہنے کی
مگر یہ کیا کہ تم سے ناطہ رکھنا اچھا لگتا ہے

تمہارے بن جو گزرے وہ گھڑی تکلیف دیتی ہے
تمہارے ساتھ گزرے پل کا سایہ اچھا لگتا ہے

بہت سی خامیاں موجود ہیں اس میں مگر پھر بھی
یہی سچ ہے کہ ہم کو وہ دوانہ اچھا لگتا ہے

رضی باتوں سے تو اظہار الفت ہو نہیں سکتا
دلوں کا حال آنکھوں سے ہی کہنا اچھا لگتا ہے

ٹونی جاوید، امریکہ



مرض ہے عشق کا شاید کہو اس کی دوا کیا ہے
خبر خود ہی نہیں مجھ کو مجھے آخر ہو کیا ہے

مجھے جب تو نہیں ملتی چلا جاتا ہوں مے خانے
پر آگے تیری آنکھوں کے شرابوں کا نشہ کیا ہے

جو تو نزدیک آتی ہے میں قابو میں نہیں رہتا
بہکنے میں بتا تو ہی بتا میری خطا کیا ہے

مجھے سب لوگ کہتے ہیں میں دیوانہ ہوں دیوانہ
بتائیں اب وہی مجھ کو بُرا کیا ہے بھلا کیا ہے

کسی بھی کام کا رکھا نہیں اس عشق نے ٹونی
میں خود سے پوچھتا ہوں اب بھلا مجھ میں رہا کیا ہے

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا
(فیض احمد فیض)

سیّدہ کوثر منور، لندن



لب پہ ہے کس واسطے حالات کی نوحہ گری
نا مناسب بات ہے ہر بات کی نوحہ گری

خوشدلی سے تو نے جب دن کی اذیت جھیل لی
کیا ضروری تھی بتا یہ رات کی نوحہ گری

ان سے کہہ دو جیت لیں آ کر ہمیں اس مرتبہ
وہ جو کرتے پھر رہے ہیں مات کی نوحہ گری

دھڑکنیں دل کی نہیں ہیں کون سمجھیگا یہاں
ہے مسلسل سوختہ جذبات کی نوحہ گری

رنگ، خوشبو، پھول، شبنم، سر پھری بیکل ہوا
کر رہے ہیں مل کے سب آفات کی نوحہ گری

سب بھلا کر زندگی نے جو دیئے ہیں فائدے
یوں نہ کر دن رات نقصانات کی نوحہ گری

ہر گھڑی رہتا تھا تجھ کو دھوپ سے کوثر گلہ
اور ہے برسات میں برسات کی نوحہ گری

شوذب کاشر، راولاکوٹ آزاد کشمیر

احساس کی دیوار گرا دی ہے چلا جا
جانے کے لیے یار جگہ دی ہے چلا جا

اس شہر کے لوگوں میں نہیں قوتِ برداشت
یہ شہر تو سارا ہی فسادی ہے چلا جا

اے قیس نما شخص یہاں کچھ نہیں تیرا
تجھ نام کی صحرا میں منادی ہے چلا جا

دستک کے لیے اٹھا ہوا ہاتھ نہ گرتا
خاموشی نے تعزیر سنا دی ہے چلا جا

دنیا تو چلو غیر تھی شکوہ نہیں اس سے
تو نے بھی تو اوقات دکھا دی ہے چلا جا

کچھ جونؔ قبیلے سے نہیں تیرا تعلق
ہر لڑکی یہاں فارہہ زادی ہے چلا جا

تا کوئی بہانہ ترے پیروں سے نہ لپٹے
دیوار سے تصویر ہٹا دی ہے چلا جا

جانا تری فطرت ہے بلانا مری قسمت
تو آ کے چلے جانے کا عادی ہے چلا جا

یکطرفہ محبت کا خسارا ہے مقدر
تجھ خواب کی تعبیر بتا دی ہے چلا جا

لگتا ہے تو قابُل میں نیا آیا ہے پیارے
افغان کا بچہ بھی جہادی ہے چلا جا

ہم ایسے فقیروں میں نہیں مادہ پرستی
تیرا تو میاں شعر بھی مادی ہے چلا جا

اے موم بدن تیرا گزارا نہیں ممکن
یہ آگ میں جلتی ہوئی وادی ہے چلا جا

ہے کون رکاوٹ جو تجھے روک رہی ہے
میں نے تو مری ذات بھی ڈھا دی ہے چلا جا

افسوس بہت دیر سے آیا ہے تو کاشرؔ
اس پانچ مئی کو مری شادی ہے چلا جا

ایم زیڈ کنولؔ، لاہور

بس ایک پل میں

سِتم رسیدہ ہوائے گُلشن
ہے دیکھ آئی
خموشیوں پر لگا کے مُہریں
قفس قفس آشیاں بنے ہیں
گلوں سے سب نے چھپا لیا تھا
جو عندلیبوں کی سازشیں تھیں
تمام قِصّہ مجھے سُنایا ہے قمریوں نے
گداز سانسوں کی چاشنی میں
ہر ایک غُنچہ مہک رہا ہے
ہوا کا آنگن بھی بے جنوں ہے
سُدی کا آنچل بھی سرنگوں ہے
صداقتوں کی صلیب پہنے
محبتوں کی شبیب پہنے
سحاب رُت کی یہ سحر کاری
ہے کتنی کاری
کیا پوچھتے ہو
گھٹائیں آئی ہیں آج گھِر کے
دلِ سیہ کی کدورتوں کو
اُجال دیں گی
بس ایک پل میں

سادہ دِلی

کسی دن موج میں آ کر
مِرے سادہ ورق پر
رکھ دیا تم نے محبت کا حسیں گوہر
ہتھیلی سو رہی تھی
چُپکے چُپکے مَن کے آنگن سے
دلِ سادہ نکل آیا
بڑی ہی سادگی سے
اُس نے گوہر پر نظر ڈالی
نِگاہِ حرص جو دیکھی دلِ ناداں کی
اک پل میں خِرد نے راستہ روکا
پھر اُس سے یہ لگی کہنے
کبھی تو اپنی فطرت سے
نِکل کر تم بھی آ جاؤ
محبت کے مناظر کو
ہتھیلی کی نِگاہوں سے
چُرا کر تم کرو گے کیا
مِری مانو کسی اندھی گلی میں لوٹ جاؤ تم
وہاں پھر سے کوئی سادہ ورق
پھر مُنتظر ہو گا کسی ایسے ہی گوہر کا

ڈاکٹر ناصر رانا، لاہور

کہنہ کاغذ

یہ کاغذ کہ جس پر
کوئی لفظ تک بھی نہ لکھا ہوا ہے
پرانے جریدے کی گودی سے نکلا
تو سوچوں کے کتنے ہی در وا ہوئے ہیں
وہ سرسوں کے پھولوں کی خوشبو
وہ کیکر کی ساون بہاریں بھی اس میں
وہ جھولے، وہ بھادوں کی برکھا پھواریں
وہ بیتے ہوئے ہاں برس ہا برس کے فسانے
وہ کہنہ زمانے
خیالوں کی دنیا میں پھر سے مِرے ہاں
کسی جل ترنگ کی صدا بن گئے ہیں

شاید

اب کی بار تو چاند بھی کتنی دھوم سے نکلا
چلتن کی اس وادی میں رہتے مَیں نے
چلتن کی اُس چوٹی پر
چاند کو اتنا روشن، اتنا پورا کب دیکھا تھا؟
تو نے جب سے مُکھ ہے موڑا، مان ہے توڑا
اِس وادی میں پھول کھلے نہ بادل جھوم کے آئے
سبز پہاڑ کی پرلی جانب
ہنّہ جھیل کا گدلا پانی بھی آنکھوں سے بھِکھیا مانگے
پر اب کے ماہ تو
چاند بھی کتنی دُھوم سے نکلا
اور پھر پچھلی شب کو
کتنے بادل جھوم کے آئے
مینہ برسا تو پھول اُگے اور دھول بہی ہے
شاید مجھ کو یہ وادی اب کھو دینی ہے
شاید مجھ کو
تیری ہستی، تیری یادیں چھوڑ چلی ہیں!

ڈاکٹر طارق جاوید، گوجرانوالہ

تضمین بر نظمِ فیض

''ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے''
(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ منٹگمری جیل ۱۵۔مئی ۱۹۵۴ء)

دیکھ جانِ چمن! تجھ میں زندہ ہیں ہم
ہم خزاؤں کے کانٹے جو چُنتے رہے
خُون ہاتھوں سے بہتا رہا دم بہ دم
تیری خاطر نئے گیت بُنتے رہے
زندگی کے لیے، روشنی کے لیے
ایک بھی خواب کو ٹُوٹنے نہ دیا
تیرے مہتاب کو ہم نے روشن رکھا
گو کڑے مرحلوں سے گُزارے گئے
''تیرے ہونٹوں کے پُھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خُشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے''
ایک تیرا تصّور کہ تھا زندگی
جس سے بس روشنی پھوٹتی ہی رہی
عشق کی سرزمیں کو سجاتے رہے
اک جنوں سے تُجھے جگمگاتے رہے
ہم کہ عاشق ترے، تیری اِک دید کو
بے دریغ اپنے خُوں کو لُٹاتے رہے
ہم کو پروانہ تھی تُو ہی تھی زندگی،
سر ہتھیلی پہ رکھے ہوئے چل پڑے
''سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی''
جو پڑی تُجھ پہ اُفتاد ہم نے کہا
خاک ہونا بجا، سر کٹانا بجا
ہم کو پروانہ تھی دیکھ اے زندگی!
جان دے دی مگر لو یہ بُجھنے نہ دی
''جب گُھلی تیری راہوں میں شامِ ستم

1._Ethel Greenglass Rosengerg(September 28,1914-June 1953); Julius Rosenberg
جولیس روزنبرگ الیکٹریکل انجینیئر تھا، جبکہ ایتھل ایکٹرس اور گلوکارہ تھی۔ 1953 میں انہیں سوویت یونین کی جاسوسی کے الزام میں سزائے موت دی گئی۔ اِن کی پھانسی کے بعد امریکی و عالمی رائے عامہ کے دباؤ پر یہ مقدمہ reopen کیا گیا۔

ڈاکٹر طارق جاوید، گوجرانوالہ

ہم چلے آئے لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دِل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حُسن کی
دیکھ قائم رہے اِس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے''
ہم کو ساری خبر تھی کہ بیتے گی کیا
لیکن اپنا یہ تُجھ سے تو اِقرار تھا
اپنے وعدے سے ہم نہ پھریں گے کبھی
تیری خاطر تُو دیکھ ہم کہاں آ گئے
''نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے''
یہ جنوں در جنوں عشق کے سلسلے
گن مشینوں سے، زنداں سے اور دار سے
کم نہ ہو پائیں گے، بڑھتے ہی جائیں گے
اپنی صُبحِ حسیں! کر تُو ہم پہ یقیں
''قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشّاق کے قافلے''

شکاری زرد کُتّا

یہ میری مُنقلب بستی
کہ اِس کے ریگ زاروں میں
کبھی چاندی چمکتی تھی
کہ اِس کے خاک کے ذرّوں پہ
سونے کا گُماں ہوتا
ہوا کی سیٹیوں پہ پُھول ہنستے
خوشۂ گندم سے جیسے چاندنی سی پُھوٹ پڑتی
اور شجر کی کونپلوں سے رَس کو ٹپکاتی بہاریں
گیت بن جاتیں
اُدھر وہ اک شکاری زرد کُتّا
جو زمیں کے وسط میں لیٹا
ہوا کی کروٹوں کو پیٹ میں بھرتا
زباں اُس کی نئے خوابوں کی اِک تعبیر بُنتی
گھومتی جاتی زمیں مرکز کے ہر جانب
نگاہوں کی ہوسنا کی سے نتھنے پھڑ پھڑا اُٹھتے
شبِ تاریک کی منحوس ساعت تھی
شکاری زرد کُتّا
آئینے سے ماپتا
اِس میری بستی کی زمیں کو چاٹنے لپکا

بشریٰ فرخ، پشاور

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

میں نے پہلا سانس لیا
تو ماں نے گھٹی میں سچ گھول کے
قطرہ قطرہ میرے منہ میں ٹپکایا
تب سے اب تک
میں نے سچ کو اپنی ذات کا محور جانا
ہر لمحہ سچائی کا پرچار کیا
سچ ہی لکھا اور پڑھا
سچ ہی بولا اور سنا
اور!
جب ہاتھ میں
سچائی کی مشعل تھامے
سہج سہج کر قدم اٹھاتے
سچ کی آخری سیڑھی تک پہنچی
تو بشریٰ
جانے کیسے
اک جھوٹے سے ہار گئی

سیّد مشکور حسین یادؔ

نظم کا نظارہ

نظم کا نظام ہے
کہ نظم خود کھڑی ہے سامنے
ہزار ہا عشوہ و ادا کے ساتھ
اپنی اک انا کے ساتھ
کہ جس کے بے شمار پہلو ہیں
جن کو دیکھنے کی تاب
کس میں ہے
کس نے آج تک
نظم کو آنکھ بھر کے دیکھا ہے
سوائے پلک جھپکنے کے
سو پلک جھپک جھپک کے ہم
نظم دیکھتے ہیں
اور خوش ہوتے ہیں
کہ
ہم نے نظم کا نظارا کر لیا

اقبال کیفی، لاہور

حبیب جالب کی یاد میں

صبحِ بے نور کی نشاندہی، کر رہا تھا کہ چل بسا وہ شخص
آسماں سے گزرنے والا تھا اور جاں سے گزر گیا وہ شخص

اس قلندر کی پیش قدمی سے بادشاہوں کے تخت لرزاں تھے
رقصِ زنجیر ہو کہ زنداں ہوں، ہر قدم مطمئن رہا وہ شخص

اے اندھیروں کے باسیو جاگو، پھر سے کوئی علم بلند کرو
زیست کے دوسرے کنارے سے، دے رہا ہے ہمیں صدا وہ شخص

جس کی آوارگی کا شیوہ تھا، داستاں چھوڑ کر چلے جانا
شاید اُس پار سے پلٹ آئے، اتنا زیادہ کہاں رُکا وہ شخص

قوم کا سرفروش اے کیفیؔ، نام جس کا حبیب جالبؔ تھا
سرکش و سرفراز و سرگشتہ، باغیانہ مزاج کا وہ شخص

بلا عنوان

جس طرح وارِدِ خلوت ہو کوئی شہزادی
جس طرح بن کے تصور کا بدل آ جائے
جس طرح عرشِ تخیل سے اُتر آئے کوئی
جیسے بے ساختہ ہونٹوں پہ غزل آ جائے

آسماں سے کسی محرومِ ضیا کی خاطر
جیسے مہتاب کوئی برسرِ بام آ جائے
جیسے دامن میں چلا آئے قیامت لے کر
جیسے محشر میں کوئی حشر خرام آ جائے

جیسے آ جائے اُفق پر رُخِ خورشید کی ضو
جیسے پردے سے کوئی جلوہ نواز آ جائے
جس طرح جان کا دشمن ہو کئی برسوں سے
اور بیمار پہ از راہِ نیاز آ جائے

یوں کبھی آ شبِ ہجراں کے پری خانوں میں
کھل اُٹھیں پھول مری روح کے ویرانوں میں

حسن عباسی، لاہور

ماں

دہشت گردی سے دُنیا کو کیا خطرہ ہے
میری ماں کو
اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے
وہ تو اپنے گھر کے بارے جانتی ہے
وہ تو اتنا جانتی ہے
مینہ برسا تو
کمرے کی بوسیدہ چھت گر جائے گی
جب روپیہ سستا ہو تو
ڈالر مہنگا کیوں ہوتا ہے
میری ماں کو
اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے
وہ تو اتنا جانتی ہے
کپڑے، برتن کیسے دھوتے،
جھاڑو کیسے دیتے ہیں
وقت کے بارے
آئن سٹائن کی تھیوری کیا ہے
میری ماں کو
اس کا کچھ بھی علم نہیں ہے
وہ تو دن بھر خاموشی سے
کپڑے سیتی رہتی ہے
میری ماں کو بس پہ چڑھنا
اور سفر کرنا
اچھا نہیں لگتا ہے
لیکن جب بھی
بیٹی کے گھر جانا ہو
یا میرے بچوں سے ملنے آنا ہو
پھر وہ بس میں شوق سے جا کر بیٹھتی ہے
پھر تو اُس کو سارے سفر اچھے لگتے ہیں
میری ماں کو
کرکٹ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے
لیکن میرا چھوٹا بھائی
جب بھی اپنے میچ کا حال سُناتا ہے
تو وہ اس کی ساری باتیں شوق سے سنتی ہے
میری ماں کو
شعر و سخن سے کیا مطلب
لیکن جب میں اپنی کوئی نظم سناتا ہوں
اس کی خالی آنکھوں میں
آنسو تیرنے لگتے ہیں

ڈاکٹر ثروت زہرا سنبل، لاہور کچھ یادوں کی جھلکیاں

آئینہ کارکردگی۔ جگنو انٹرنیشنل

5 فروری 2014 پاک ٹی ہاؤس لاہور میں علمی، ادبی، سماجی اور ثقافتی تنظیم جگنو انٹرنیشنل کا افتتاحی اجلاس میں لایا گیا۔ جس کی صدارت بین الاقوامی شہرت کی حامل، شریف اکیڈمی جرمنی کی طرف سے اُردو ادب کا گوہرِ انمول کا خطاب پانے والی معروف اردو و پنجابی کی شاعرہ، ادیبہ، ایڈیٹر احساس جرمنی، چیف ایگزیکٹو، جگنو انٹرنیشنل محترمہ ایم زیڈ کنولؔ نے کی۔ تقریب میں شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور طلبہ کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں جگنو انٹرنیشنل کا تعارف کرایا گیا جو راؤ قاسم علی شہزاد، جنہیں پیار سے جگنو پکارتے تھے، اُن کی یادوں کے چراغ روشن کرنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہے۔ راؤ قاسم علی شہزاد ایک بہترین شاعر، کہانی کار، کمپیئر، فی البدیہہ مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ گوناگوں خصوصیات کے حامل تھے جو بھر پور جوانی میں اپنے بہت چھوٹے بچّوں کو داغِ یتیمی دے کر ہمیشہ کے لئے کبھی نہ پُر ہونے والا ایک خلاء چھوڑ گئے۔ ۵۔فروری اُن کی سالگرہ کا دن ہے اس لئے جگنو انٹرنیشنل کی رسمِ افتتاح کا آغاز اس موقع کے لئے خاص طور پر بنوائے ہوئے کیک کو کاٹ کر کیا گیا۔ اس کے بعد چیف ایگزیکٹو ایم زیڈ کنولؔ نے تعارفی کلمات ادا کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ جگنو انٹرنیشنل ایک آزاد ادبی، علمی، سماجی اور ثقافتی ادارہ ہے جو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں اپنی خدمات وقف رکھے گا اور یہ کہ بحیثیت تنظیم اس کا کسی مذہبی یا سیاسی جماعت سے تعلق نہیں ہے۔ یہ ادارہ ہر قسم کی گروہ بندی، اجارہ داری اور تعصب سے بالاتر ہو کر جینوئن تخلیق کاروں کی پذیرائی کے لئے اقدامات کرے گا۔ بزم میں موجود تمام احباب نے ایم زیڈ کنولؔ کی شاعری، شخصیت اور عزائم کو سراہتے ہوئے انہیں اپنے بھر پور تعاون کا یقین

دلاتے ہوئے کہا کہ ایم زیڈ کنولؔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اقدار کی امین ہیں۔ان کا یہ جذبہء قابلِ ستائش ہی نہیں قابلِ تقلید بھی ہے۔

سِٹی 42 نے پروگرام کی کوریج کی۔ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد نے محترمہ کی اس کاوش کو سراہا اور اسے ادب میں ایک تازہ ہوا کے جھونکے سے تعبیر کیا۔انہوں نے کہا کہ ایم زیڈ کنولؔ نے جس طرح شاعری میں کامیابی کے جھنڈے گاڑھے ہیں اسی طرح تنظیم کی سربراہ ہونے کی حیثیت سے بھی یقیناً کامیابیوں سے ہمکنار ہوں گی۔انھوں نے مردوں کے اس معاشرے میں جو آواز اٹھائی ہے، وہ بارش کا پہلا قطرہ ہے۔انھوں نے ادبی دنیا میں ہر قسم کی گروپ بندی سے الگ رہ کر صرف اور صرف اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر یہ سفر طے کیا ہے۔ ہمارا بھرپور تعاون ان کے ساتھ رہے گا۔پروگرام کے دوسرے حصے میں ادبی نشت کا اہتمام کیا گیا تھا۔تمام حاضر شعراء نے اپنا خوبصورت کلام پیش کر کے بزم کو یادگار بنا دیا۔13۔اپریل (بروز اتوار) 2014 سہ ماہی احساس جرمنی کی تقریبِ اجراء کا انعقاد الحمرا ادبی بیٹھک، دی مال لاہور میں کیا گیا،تقریب کی صدارت معروف شاعر،ادیب،کالم نگار اور تجزیہ نگار حسن عسکری کاظمی نے کی۔مہمانانِ خصوصی پروفیسر ناصر بشیر اور رشید مصباح تھے جبکہ مہمانانِ اعزاز میں پروفیسر عباس مرزا اور نیوجرسی،امریکہ میں شریف اکیڈمی کے ڈائریکٹر محمد سعید چوہان شامل تھے۔احباب نے ایم زیڈ کنولؔ،ایڈیٹر احساس کی علم وادب کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کو سراہا۔انھوں نے کہا یہ منفرد کتابی سلسلہ اردو ادب کے گلشن میں مہکتے پھول کی مانند ہے جو دبستانِ ادب میں اپنی خوشبو سے اہلِ علم وادب کو معطر کر رہا ہے۔

13۔ستمبر 2014ء بروز ہفتہ شام چار بجے چوپال،ناصر باغ، لاہور میں برطانیہ میں مقیم کالم نگار سہیل احمد لون کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔جس کی صدارت چیئر مین گلشنِ ادب پاکستان،معروف شاعر و ادیب پروفیسر عاشق رحیل نے کی۔مہمانِ خصوصی استاد شاعر اقبال راہی تھے،جبکہ مہمانانِ اعزاز خواجہ فرید سنگت پاکستان کے

صدر حکیم سلیم احمد ملک اور خوبصورت لب ولہجہ کی شاعرہ محترمہ شگفتہ غزل ہاشمی تھیں۔ تقریب میں پرائیڈ آف پرفارمینس آرٹسٹ ڈاکٹر اعجاز نور، شاہ اکبر لاہوری، نامور نوجوان صحافی آدم شیر کے علاوہ شعراء وادباء کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ ویلیو ٹی وی نے پروگرام کی بھرپور کوریج کی۔ 6۔دسمبر 2014 بروز ہفتہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین میانوالی میں پروفیسر رابعہ بتول کے شعری مجموعے ''سحر تک دیپ جلنا ہے'' کی تقریب رونمائی اور جگنو انٹرنیشنل کی روح ورواں ایم زیڈ کنول کے اعزاز میں محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ دسمبر 2014 میں ہی جگنو انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام چیئرنگ کراس، مال روڈ لاہور پر پشاور میں دہشت گردی کا شکار ہونے والے شہیدوں اور ان کے خاندانوں سے اِظہارِ یک جہتی کے لئے پنجاب کی ادبی تنظیموں نے احتجاجی مظاہرہ کیا گیا۔ جس میں جگنو انٹرنیشنل کے ایماء پر پنجاب بھر کی تنظیموں نے شمولیت کی۔ دانشوروں، صحافیوں، سماجی کارکن، طلبہ، سکاؤٹس اور بچوں کی کثیر تعداد نے اس موقع پر دہشت گردی کی شدید مذمت کی ۔ ایم زیڈ کنولؔ، چیف ایگزیکٹو جگنو انٹرنیشنل نے اپنے خطاب میں کہا یہاں سے ہماری آواز پوری دنیا میں جائے گی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔ شہیدوں کا لہو حساب مانگ رہا ہے۔ اس موقع پر زبردست نعرے بازی کی گئی۔ ایم زیڈ کنولؔ جو خود بھی پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں، انھوں نے شہید پرنسپل طاہرہ قاضی کو ہم منصب ہونے کے حوالے سے خراج پیش کیا اور معلّمہ افشاں احمد، جسے زندہ جلا دیا گیا لیکن جلتے جلتے بھی بچوں کا دفاع کرتی رہیں، انھیں بھی منظوم خراج پیش کیا۔ ایک اور معلّمہ کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے ذاکر خواجہ نے بتایا کہ شہید معلّمہ بینش ان کی عزیزہ تھیں۔ ان سے تعزیت کی گئی۔ سب شہداء کے لئے دعا کی گئی اور آخر میں موم بتیاں جلا کر اور پھولوں کی یاد میں پھول سجائے گئے۔ سٹی 42، چینل ۵، ڈان، ایکسپریس اور جیو نے پروگرام کی بھرپور کوریج کی۔

۱۰۔ جنوری 2015 جشن عید میلا د النبیؐ کے سلسلے میں محفل میلاد اور نعتیہ مشاعرے کا انعقاد چوپال، لوئر مال پر منعقد کیا۔ گیا۔ ۱۱۔ جنوری 2015 بروز اتوار شام 4 بجے جگنو انٹر

نیشنل کی تنظیم سازی کے لئے اجلاس منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت جگنو انٹرنیشنل کی چیف ایگزیکٹو محترمہ ایم زیڈ کنول نے کی۔ اجلاس میں تنظیم سازی کے بابت مشاورت سے فیصلے کئے گئے۔

8۔فروری 2015 بروز اتوار پنجاب انسٹیٹیوٹ آف لینگوئج آرٹ اینڈ کلچر، قذافی سٹیڈیم، لاہور میں تقسیمِ تقریبِ ایوارڈ و محفلِ موسیقی کا انعقاد عمل میں لایا گیا۔ جس میں لاہور کے علاوہ پاکستان بھر سے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، سماجی شخصیات اور طلبہ و طالبات نے شرکت کی۔ اس موقع پر جگنو انٹرنیشل کے عہدیداران کو شیلڈ آف نامینیشن اور اسناد سے نوازا گیا۔ جس میں پروفیسر لطیف ساحل، ڈاکٹر اختر شمار، عفت علوی (ممبرز مشاورتی کونسل) بشریٰ حزیں (صدر) شگفتہ غزل ہاشمی (نائب صدر) احمد خیال (جنرل سیکرٹری) ڈاکٹر ثروت زہرا سنبلؔ، (سیکرٹری فنانس) مقصود چغتائی (سیکرٹری ۔نشرواشاعت) اقبال کمبوہ (سیکرٹری ۔سوشل میڈیا) ارم ہاشمی (کوآڈینیٹر) جگنو انٹرنیشنل ،میانوالی، پروفیسر میاں مسعود احمد (کوآڈینیٹر) جگنو انٹرنیشل (امریکہ)، وحید قمر (جرمنی) ثنا سونی (بلوچستان) سید کائناتی چترال) ڈاکٹر فہیم کاظمی ، بہاولپور، راؤ شامروز احمد (سٹوڈنٹ کوآڈینیٹر) لاہور گرامر سکول، بلال احمد جعفری (سٹوڈنٹ کوآڈینیٹر) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، یاقوت فاطمہ (سٹوڈنٹ کوآڈینیٹر) عائشہ ڈگری کالج، لاہور شامل تھے۔ پروگرام کے اگلے مرحلے میں شاعروں ادیبوں اور دانشوروں کو ایوارڈز، اسناد، اور خطاب سے نوازا گیا۔ (ایوارڈ برائے صحافتی خدمات) فرنٹیئر پوسٹ ،رحمت شاہ آفریدی ، (فروغِ ادب ایوارڈ) محمد عاصم بٹ (ڈائریکٹر، اکادمی ادبیات ،لاہور، اور پروفیسر احمد ساقی، پرنسپل گوگیرہ ،اوکاڑہ ،ایوارڈ برائے ادبی خدمات (افسانہ) سید نوشاد کاظمی ،مظفر آباد، آزاد کشمیر، (آن لائن ادبی خدمات) نسیم شیخ ،کراچی، (اِدارتی خدمات) اعتبار ساجد، فروغِ فن وثقافت ایوارڈ، غلام عباس فراست، الماس شمی (امریکہ) فروغِ عالمی ادب ایوارڈ، عالمی سطح پر شفیق مراد، جرمنی کی خدمات فروغِ ادب کے اعتراف

میں انہیں سفیرِ ادب کے خطاب سے جبکہ ممتاز اردو و پنجابی کے شاعر، ماہرِ عروض زُلفی سید کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پروفیسر کلیم احسان بٹ ، ڈاکٹر فرحت عباس (راولپنڈی) ،لیاقت عیش (امریکہ) عدیل برکی و پروفیسر آغا مزمل (لاہور) ڈاکٹر لبنیٰ آصف ،سید صداقت نقوی اور عتیق خان (میانوالی) کو شیلڈ آف آنر سے نوازا گیا۔جگنو انٹرنیشنل عالمی سطح پر فروغِ ادب کے لئے سرگرمِ عمل ہے۔شاعر، ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی ،دہلی، انڈیا،شاعر، ادیب، ماہرِ عروض ،نقشبند قمر نقوی ،انڈیا ،ادیبہ، محققڈاکٹر عشرت ناہید، اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس، انڈیا،شاعر،ادیب،رئیس الدین رئیس، انڈیا،ایڈیٹر انچیف، بہار اردو یوتھ فورم،امروز ہند جاوید، انڈیا، ادیب، ماہرِ تعلیم، ڈاکٹر راغب دیشمکھ، لکھنؤ، انڈیا کو آن لائن سندِ اعزاز سے نوازے جانے کا اعلان کیا گیا۔ پروفیسر لطیف ساحل، پروفیسر احمد ساقی، ڈاکٹر اختر شمار، ڈاکٹر فرحت عباس، عاصم بٹ، لیاقت عیش، مقصود چغتائی، نسیم شیخ، پروفیسر کلیم احسان بٹ اور دیگر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں نے فروغِ ادب کے لئے محترمہ ایم زیڈ کنول، چیف ایگزیکٹو، جگنو انٹرنیشنل کی خدمات کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا، جو ہر قسم کی گروپنگ اور تعصب سے بالاتر ہو کر اپنے تن، من، دھن سے علم و ادب کی آبیاری میں سرگرمِ عمل ہیں۔کراچی ، راولپنڈی میانوالی ،مظفر آباد(آزاد کشمیر) سرگودھا،اور اوکاڑہ سے نامور شخصیات کی خصوصی طور پر اس تقریب میں شمولیت کے لئے تشریف آوری جگنو انٹرنیشنل کی فروغِ ادب کے لئے خدمات کا اعتراف ہے۔ایم زیڈ کنول نے جگنو چیریٹی فنڈ کے اجرا کے لئے تجویز پیش کی تاکہ مستحق ،لیکن جینوئن ادیبوں، شاعروں اور ان کے خاندانوں کی کفالت کے لئے کوششیں کی جا سکے۔اس تجویز کا خیر مقدم کیا گیا اور آئندہ کسی تقریب میں اس فنڈ کی لانچنگ کے لئے عملی اقدامات کئے جائیں۔ پروگرام کے اگلے مرحلے میں محفلِ موسیقی کا اہتمام کیا گیا۔معروف کلاسیک گلوکار اور فروغِ فن میں کوشاں غلام عباس فراست نے ایم زیڈ کنول، پروفیسر لطیف ساحل اور ڈاکٹر اختر شمار کا کلام

انتہائی خوبصورت انداز میں پیش کر کے داد وتحسین وصول کی۔ معروف فوک سنگر عدیل برکی اور منظور ملنگ نے اپنے فن کا مظاہرہ کر کے محفل کا رنگ دوبالا کر دیا۔ آخر میں پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج آرٹ اینڈ کلچر کے کیفے میں جگنوانٹرنیشنل کی پہلی سالگرہ کا کیک کاٹا گیا۔ جیو ٹی وی چینل نے پروگرام کی مکمل ریکارڈنگ کی۔

۱۹۔ جون 2015 پاک ٹی ہاؤس میں محفلِ مشاعرہ اور ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ جس کی صدارت معروف شاعر، ادیب، ڈرامہ نگار اور اینکر پرسن شاہد چوہدری نے کی۔ مہمانِ خصوصی انیس احمد اور حفیظ اللہ بادل تھے 22۔ اگست بروز ہفتہ 2015 چوپال ناصر باغ، لاہور میں معروف شاعر اختر ہاشمی کے اعزاز میں تقریب ڈاکٹر سعادت سعید کی صدارت میں انعقاد پذیر ہوئی۔ جگنوانٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی نسیم شیخ کی تصنیف ''موجِ سخن'' کی تقریبِ اجراء کے سلسلے میں 21 نومبر 2015 چوپال ناصر باغ، لاہور میں ایک پُر وقار تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ ۱۰۔ دسمبر 2915۔ ا، ڈائریکٹر اور براڈ کاسٹر پنج ریڈیو (یو ایس اے) الماس شبی کے اعزاز میں استقبالیہ اور تقریبِ سالگرہ پاک ٹی ہاؤس ہوئی۔ صدارت سابق چیئر مین شعبہ ابلاغیات پنجاب یونیورسٹی ڈاکٹر شفیق جالندھری نے کی۔۔ 20 دسمبر 2015 الحمرا ادبی بیٹھک، دی مال، لاہور میں شیخ المشائخ پیر سیّد دیوان آلِ حبیب علی خان، سجادہ نشین، درگاہ نشین، حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری کی زیرِ صدارت صاحبِ تصوف شاعر و ادیب ڈاکٹر فہیم رضا چشتی الکاظمی کی تصوف کے موضوع پر (تالیف و ترجمہ) تصنیف ''**روضۃ الاقطاب**'' **کی تقریبِ اجراء الحمراء ادبی بیٹھک، دی مال، لاہور میں** منعقد ہوئی، جس کے مہمانِ خصوصی پیر مخدوم سید نفیس الحسن بخاری، سجادہ نشین، چیئر مین، صوفی ازم کونسل پاکستان واُچ شریف ٹرسٹ تھے۔

ایک انتہائی یادگار تقریب۔۔۔ **۹۔ اپریل 2016 بروز ہفتہ** الحمرا آرٹس کونسل لاہور **میں سالانہ تقریبِ تقسیمِ ایوارڈ و مشاعرہ کا انعقاد** اور عالمی مشاعرہ، جس کی صدارت کے لئے اردو تحریک عالمی۔ برطانیہ کے صدر ڈاکٹر عبدالغفار بطورِ خاص بیماری کی حالت میں

لندن سے تشریف لائے ۔ اور یہاں سے واپس اپنے وطن جاتے ہی راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔اس تاریخی موقع پر اہلِ قلم ونقد ونظر کو انکی علمی وادبی کاوشوں کے اعتراف میں اسنادو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ڈاکٹر عبدالغفار عزم کے شعری مجموعہ ''نقشِ اول'' کی تقریب رونمائی اور عالمی مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ ہوا۔جس میں پاکستان اور بیرونِ مما لک سے اہل علم و دانش اور شعراء کی بھاری تعداد نے شرکت کی ۔مہمانوں کو پھولوں کے گلدستے پیش کر کے ان کا استقبال کیا گیا مختلف شعبہ ہائے جات میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والوں کو ایورڈز سے نوازا گیا۔ کو آرڈینیٹر جگنو انٹرنیشنل ،موریشیس ، محترم اختر ہاشمی، صدر جگنو انٹرنیشنل، لاہور محترمہ شگفتہ غزل ہاشمی، میڈیا کوآرڈینیٹر ،میانوالی، جناب سید صداقت نقوی،اور محترم ضماد گریوال کنوینئر لاہور کو جگنو انٹرنیشنل کی جانب سے شیلڈز آف نامینیشن پیش کی گئیں ۔ایوارڈز کی کیٹیگری میں سوشل میڈیا ایوارڈ جناب حسیب اعجاز عاشر، یواے ای، خدمات برائے فروغِ سیاحت جناب مقصود چغتائی،ادبی ستارے ایوارڈ، دوادبی جوڑوں ،شگفتہ غزل ہاشمی ،مظہر جعفری، لاہوراور ڈاکٹر لبنیٰ آصف، ڈاکٹر آصف مغل میانوالی کو عطا کیا گیا،حسنِ کارکردگی ایوارڈ (شعروسخن) محترم زیڈاے زلفی وزیرآباد،حسنِ کارکردگی ایوارڈ (صنفِ نثر) بشریٰ اقبال ملک، جرمنی ،خیبر پختونخواہ کی پہلی صاحبِ کتاب نعت گو شاعرہ محترمہ بشریٰ فرخ، پشاور کو نشانِ اعزاز سے اور محترم اختر ہاشمی، موریشیس کو اخترِ ادب کے خطاب سے اور محترم کیپٹن (ر) عطامحمد خاں، ایگزیکٹو ڈائریکٹر، الحمرا آرٹس کونسل، لاہور کو ان کی بے لوث خدمات کے اعتراف میں فروغِ ادب،فن و ثقافت ایوارڈ سے نوازا گیا۔لوحِ اعزاز برائے پذیرائی منصبِ صدارت شاعر،ادیب، دانشور، بانی وصدر ،اردو تحریک عالمی، یوکے، ڈاکٹر عبدالغفار عزم ،لندن کو پیش کیا گیا۔احمد خیال کو ان کی کتاب ''ستاروں سے بھرے باغات'' اور محترمہ فرزانہ فرحت ،انگلینڈ کو''خواب خواب زندگی'' پر ایوارڈ دیئے گئے ۔جناب ندیم بخاری وعتیق خاں نیازی میانوالی ،ہمایوں شرافت،محترمہ تسنیم کوثر،ایس ایچ ایس ،رئیل بلڈرز اینڈ اسٹیٹ، بحریہ ٹاؤن ، لاہورانور جاوید

ہاشمی، رسالپور، شاعر، ادیب، سجاد ہاشمی، کراچی کو شیلڈ آف آنرز سے نوازا گیا۔

دوسری نشست میں ڈاکٹر عبدالغفار عزم کے شہرہ آفاق مجموعہ کلام ''نقشِ اول'' کی تقریبِ رونمائی اور مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالغفار کی کتاب کی نقاب کشائی کی رسم جناب کیپٹن (ر) عطا محمد خاں نے اپنے دستِ مبارک سے کی۔ بعد میں ڈاکٹر عبدالغفار عزم کے اعزاز میں محفلِ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر سعادت سعید، سلیم شہزاد، پروفیسر عاشق رحیل، نزاکت علی عازم (میر پور) اعجاز اللہ ناز، جاوید قاسم، عمرانہ انعم، زاہد ہما شاہ، اعجاز فیروز اعجاز، ذاکر خواجہ، عمرانہ انعم، روبیہ جیلانی، پروفیسر نذر بھنڈر، ڈاکٹر ایم ابرار، ممتاز راشد لاہوری، جاوید قاسم، ، مظہر قریشی، ندا سرگودھوی، آغا ارشد، میاں صلاح الدین ، ڈاکٹر فاخرہ شجاع، کرن شجاع، ڈاکٹر فرخ، ندا سرگودھوی، ارشد منظور، عمران حفیظ، نثار منیر، ایم عثمان محمود، مظہر جعفری، اسد علی باقی، اعجاز اللہ ناز، اعجاز ثاقب، سلمان رسول، سہیل یار، بشیر ناطق، نزاکت علی عازم، سلیم صابر، ڈاکٹر عنبرین ، ، لیاقت عیش، اور منصور فائز، سمیت بیرونِ ممالک اور پاکستان بھر سے تشریف لائے ہوئے مہمان شعراء کے علاوہ مقامی شعراء کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔ کوہِ نور ٹی۔ وی چینل نے پورے پروگرام کی بھرپور ریکارڈنگ کی۔ یوں یہ تقریب رات گئے تک جاری رہی۔ آخر میں پُر تکلف طعام سے تواضع فرمائی گئی۔

12۔فروری 2017ء۔، ادبی بیٹھک، دی مال، لاہور میں سالگرہ راؤ قاسم علی شہزاد اور سالگرہ جگنو انٹرنیشنل کے یادگار موقع پر مسرت کلانچوی کی زیرِ صدارت جگنو انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام اشاعت پذیر ہونے والے نوشاد کاظمی (مظفر آباد، آزاد کشمیر) کے افسانوی مجموعے "مسافرت" کی تقریبِ اجراء کا اہتمام کیا گیا۔ جگنو انٹرنیشنل کی پانچویں سالگرہ 5۔فروری۔2019ء۔، بروز منگل، الحمرا ادبی بیٹھک، مال روڈ، لاہور میں منعقد ہوئی۔ پروگرام شروع کرنے سے پہلے راحت جعفری کی سرکردگی میں سکاؤٹس نے قومی ترانہ پیش کیا۔ کشمیریوں سے اظہارِ یک جہتی کے حوالے سے بھی گفتگو کی گئی۔ - صدارت نذیر

قیصر نے کی۔ مہمان خصوصی جناب ڈاکٹر کنول فیروز و جناب پروفیسر نذر بھنڈر تھے جبکہ میانوالی سے میڈیا سیکرٹری جگنو انٹرنیشنل میانوالی جناب صداقت نقوی نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ جناب جمیل ناز (منڈی بہاءالدین) مہمانِ اعزاز تھے۔ مقررین نے اپنے خطاب میں جگنو انٹرنیشنل کے حوالے سے بھرپور گفتگو کی اور ایم زیڈ کنول کو اس مستحسن اقدام پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے پانچ سال کے مختصر عرصے میں کی جانے والی ان کی کوششوں کو دہرایا۔ نذیر قیصر نے راؤ قاسم شہزاد (جگنو) کی سالگرہ اور جگنو انٹرنیشنل کی پانچویں سالگرہ کی تقریب میں صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا راؤ قاسم شہزاد جگنو جیسے قلمکار کی موت ادب کی دنیا میں ایک بہت بڑا نقصان تھا مگر ان کی جگنو بہن ایم زیڈ کنول نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر علم وادب کے میدان میں ایک جری سالار بن کر ثابت قدمی سے اس کمی کو پورا کیا۔ ۔جگنو ادبی سرزمین کو اپنی روشنیاں دے گیا تھا مگر جگنو کی جگنو بہن ایم زیڈ کنول نے اپنی ہمت و جرات سے 2014 کو ادبی علمی سماجی وثقافتی تنظیم جگنو انٹرنیشنل بنا کر ان روشنیوں سے سات سمندر پار تک ادب سرائے کو منور کیا۔ ایم زیڈ کنول کی جوان ہمتی کو سلام اور راؤ قاسم علی شہزاد (جگنو) کو سالگرہ اور جگنو انٹرنیشنل کو پانچویں سالگرہ مبارک ھو۔ ۔مہمانِ خصوصی ڈاکٹر کنول فیروز نے کہا کہ ایم زیڈ کنول نے اپنی شاعری اور ادبی کاوشوں کے ذریعے خود کو منوایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے پورے لاہور کیا پورے پنجاب میں ایسی اور کوئی مثال دکھائی نہیں دیتی۔ یاسر شمعون نے انہیں محبت، اعتماد اور عشق کی علامت قرار دیا۔ اختر ہاشمی، پروفیسر نذر بھنڈر اور ڈاکٹر طارق شریف زادہ نے کنول کے فن اور شخصیت کے حوالے سے خراج تحسین پیش کیا انہوں نے کہا کہ ایم زیڈ کنول جو جدوجہد کر رہی ہیں وہ معمولی کام نہیں۔ یہ بغیر کسی صلے یا ستائش کی تمنا کے تن تنہا مصروف عمل ہیں۔ کا۔ شگفتہ غزل ہاشمی نے علم وادب اور فن کے لئے ایم زیڈ کنول کی بےلوث خدمات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ جگنو انٹرنیشنل کے پروگراموں کے لئے ہمیں کسی ادارے کی مالی اعانت حاصل نہیں بلکہ ایم زیڈ کنول تمام اخراجات اپنی جیب سے کرتی ہیں اس طرح وہ دامے، درمے،

سخنے پانچ سالوں سے تن تنہا یہ بوجھ اٹھا رہی ہیں۔شیراز انجم نے کہا ایم زیڈ کنول روشن راہوں کی مسافر ہیں اور جگنو کی ٹمٹماتی روشنیوں کو آفتاب بنا کر ادب کی کائنات کو ضیا بار کر رہی ہیں۔میں تو یہی کہوں گا یہ لاریب ادب کی ملکہ ہیں۔دبستانِ ادب میں ایسی شخصیات بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔کم ازکم میری نظر میں تو اگر پاکستان کی بات کروں تو اور کوئی نہیں۔جگنو انٹرنیشنل کو تن آور شجر کرنے پر میں انہیں اور ان کی تمام ٹیم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔۔احباب نے راؤ قاسم علی شہزاد (جگنو) کو بھی خراج تحسین پیش کیا۔صداقت نقوی اپنے ساتھ میانوالی سے روزنامہ ضرورت کا سپیشل ایڈیشن لائے تھے جو جگنو انٹرنیشنل کی پانچویں سالگرہ کے حوالے سے ترتیب دیا گیا تھا۔دیگر احباب بھی تحائف لائے تھے۔ف ایگزیکٹو،ایم زیڈ کنول نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔اور پھر احباب کی محبتوں کے ہالے میں جگنو انٹرنیشنل کی پانچویں سالگرہ اور راؤ قاسم علی شہزاد (جگنو) کی سالگرہ کا کیک کاٹ کر ایک اور خوبصورت شام کو یادگار بنا دیا گیا۔

جگنو انٹرنیشنل کے تمام پروگرامز کی نقابت و میزبانی ایم زیڈ کنولؔ نے کی

ایم زیڈ کنول۔لاہور۔۔ادبی شہر لاہور میں ادب نوازی

الحمرا ادبی بیٹھک، دی مال، لاہور جو گزشتہ دو ماہ سے اس کی تزئین و آرائش کے سلسلے میں بند تھی۔اس لئے وہاں ادبی سرگرمیاں تعطّل کا شکار تھیں۔ماہ دسمبر میں یہ سلسلہ پھر سے بحال ہوا اور اس سلسلے کی سب سے پہلی تقریب ممتاز شاعر اور خطاط،چیئرمین ادبی تنظیم ،ادب ورثہ جناب جمیل ارشد خطاط جو کئی مہینوں سے صاحبِ فراش تھے اور حکومتی سطح پر کینسر مریضوں کی دواؤں کی ترسیل بند ہونے کے باعث صحت کی تشویشناک صورتِ حال سے دوچار تھے۔الحمد للہ ربِّ رحمٰن و رحیم کے فضلِ خاص سے وہ صحتیابی سے ہمکنار ہوئے تو علمی،ادبی،سماجی و ثقافتی روایات کی امین تنظیم جگنو انٹرنیشنل نے ان کے اعزاز میں جگنو سالانہ مشاعرہ کا اہتمام کر ڈالا۔جس میں پنجاب کے دور اُفتادہ شہروں سے احباب نے رونق افروز ہو کر ان لمحات کو امر کر دیا۔پروگرام کی صدارت ملتان کی معروف علمی،ادبی،

سماجی اور صحافتی شخصیت، جناب صابرانصاری نے کی ۔ جناب توقیراحمد شریفی اور جناب شہباز ساحر (بانی وچیئرمین الفانوس ادبی تنظیم ،انٹرنیشنل) نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت فرمائی جبکہ مہمانانِ اعزاز میں جناب ممتاز راشدلاہوری، جناب محمدادریس (ڈپٹی ڈائریکٹر ،نیلم ،جہلم ،مظفرآباد،آزادکشمیر،میجراعظم کمال (پرنسپل،ڈی پی ایس، بہاولنگراورنسلِ نو کے لئے ستاروں کوچھونے کےعزائم رکھنے والےنوجوان ڈائریکٹرآپریشنز پنجاب یوتھ کونسل (پنجاب گورنمنٹ)جناب رضوان ہاشمی تھے ۔مہمانوں کاپُر تپاک استقبال کیا گیا۔انہیں جگنوانٹرنیشنل،ادبی ورثہ اوردیگرخصوصا ً"ممتاز سیاسی وسماجی کارکن،ادب دوست رفعت سعود نے پھولوں کےگلدستے پیش کئے گئے ۔مہمانوں کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے ۔ ۔تقریب کی نقابت کےفرائض حسبِ معمول تنظیم کی چیف ایگزیکٹوایم زیڈکنول نے ادا کئے ۔انہوں نےجمیل ارشدخطاط کاتعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ مایہ نازآرٹسٹ جو ہاتھ میں فن،نظرمیں شرافت اوراپنے پہلومیں دردِانسانیت لئے ہوئے ہے بلاشبہ ایک صوفی با عمل ہے۔جس نے اپنی ماں کی نصیحت پرفنِ گلوکاری کواس وقت خیربادکہاجب وہ اپنےفن کےعروج پر تھے بالکل اسی طرح جیسےجنیدجمشید نےتاریخ رقم کی ایسی ہی بلکہ اس سےمنفرد تاریخ جمیل ارشدخطاط نےرقم کی ہے۔انہوں نےاپنی ماں کی خواہش کامان رکھ کےگائیکی چھوڑی لیکن یہ ماں کی دعائیں ہی تھیں جنہوں نے ان کی زندگی کوایک اور جہت سے روشناس کرادیا۔اورپھرخطاطی،شاعری اورآرٹ ان کی زندگی کااوڑھنا بچھونا بن گیا۔انہی دعاؤں کایہ اعجازربِّ کریم نےدکھایا کہ انہیں ایشیا کی عظیم اسلامک یونیورسٹی جامعہ اشرفیہ کا نہ صرف مدرس تعینات کیا بلکہ ان کی پینٹنگز اورخطاطی کےنمونوں کواتنامعتبرکیا کہ وہ جامعہ اشرفیہ کی دیواروں پرآویزاں ہوکر ہرآنے جانے والے سےخراجِ تحسین وصول کرنے لگے۔اسی پرموقوف نہیں بلکہ پاکستان کی نمایاں انٹرنیشنل کمپنیز کےدفاترنےبھی ان کی پینٹنگز کواپنے دفاترکی زینت بنانا اپنے لئے ایک اعزازسمجھا۔آپ ایک نامورشاعر ،خطاط اورآرٹسٹ ہونے کےساتھ ساتھ ایک حساس سماجی کارکن بھی ہیں ۔معذوربچوں کے

لئے سکول، علم روشنی پروگرام تنظیم کے ذریعے علم و ہنر بانٹنے کی توفیق بلا شبہ ان کے لئے صدقۂ جاریہ رہے گی۔ رواں تقریب کا آغاز رب ذوالجلال کے پاک نام سے کیا گیا۔ اس پاک نام سے ساعتوں کو معمور کرنے کی سعادت بھی انہیں ہی حاصل ہوئی بعد ازاں صفیہ صابری نے نذرانۂ عقیدت بحضور رسولِ مقبول ﷺ پیش کیا۔ تقریب دو نشستوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصے میں صاحبِ شام، جناب جمیل رشد خطاط کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ صابر انصاری، توقیر شریفی، ممتاز راشد لاہوری اور محترمہ شگفتہ غزل ہاشمی (صدر تنظیم) نے جمیل ارشد خطاط کی فن اور شخصیت کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان کی ادب، آرٹ اور سماجی خدمات کو سراہا۔ اور کہا کہ ان کے فن کا دائرہ صرف ان کی ذات تک محدود نہیں بلکہ ادب ورثہ ادبی تنظیم کے چیئرمین کی حیثیت سے فروغِ علم وادب میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ 2010 سے وہ صحت کے مسائل سے دوچار ہیں۔ بلڈ کینسر جیسے موذی مرض سے نبرآزما ہونے کے باوجود ہمتوں کے اس شناور نے ہار نہیں مانی۔ رب کائنات کا شکر ہے جس نے انہیں نئی زندگی عطا فرمائی۔ مسرتوں سے بھرپور ان لمحات کو امر بنانے کے لئے علمی، ادبی، سماجی و ثقافتی روایات کی امین تنظیم، جگنو انٹرنیشنل نے آج کے اس تاریخی موقع کو یعنی جگنو سالانہ مشاعرہ کے دن تقریبِ پذیرائی کا اہتمام کر ڈالا۔ جس کے لئے جگنو انٹرنیشنل کی تمام ٹیم، ان کے عہدیداران و ممبران مبارکباد کے مستحق ہیں۔ خصوصا" اس کی بانی و چیف ایگزیکٹو ایم زیڈ کنول خصوصی ستائش کی مستحق ہیں۔ ادب میں ان کی بے لوث خدمات بلاشبہ چراغِ راہ رہیں گی۔ جمیل ارشد خطاط جو عجز وانکساری کا پیکر ہیں انہوں نے انتہائی عاجزی کے ساتھ تمام مہمانوں اور تنظیم کے تمام ارکان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا کہ میرے ربّ نے مجھے تیسری بار یہ موقع دیا ہے اس کے اس گراں قدر عطیہ پر سراپا سپاس ہوں۔ آج کا یہ پروگرام جو ایم زیڈ کنولؔ چیف ایگزیکٹو، جگنو انٹرنیشنل نے ترتیب دیا ہے۔ اس کے لئے میرے پاس شکریہ کے الفاظ نہیں لیکن اس احساس سے بہت تقویت ملی ہے کہ میری تکلیف میں میرے احباب میرے ساتھ ہیں۔ بلاشبہ ان کی دعائیں میرے لئے

بہت بڑا سرمایہ ہے۔ میں اس موقع پر ان سب دعا مانگتے ہاتھوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

دوسری نشست میں محفلِ مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ ایم زیڈ کنولؔ نے میزبان کی حیثیت سے سب سے پہلے اپنا کلام نذرِ سامعین کیا۔ اس کے علاوہ صابر انصاری، توقیر احمد شریفی، شہباز ساحر (گوجرانوالہ) ممتاز راشد لاہوری، محمد ادریس (ڈپٹی ڈائریکٹر واپڈا۔ نیلم، جہلم پراجیکٹ مظفر آباد) میجر اعظم کمال، پرنسپل، ڈی پی ایس، بہاولنگر، رضوان ہاشمی، (ڈائریکٹر آپریشنز، پنجاب یوتھ کونسل، حکومتِ پنجاب) اکرم سحر فارانی، پروفیسر نذر بھنڈر، شگفتہ غزل ہاشمی، (صدر جگنو انٹرنیشنل) مظہر جعفری، بابر ہاشمی، پروین وفا ہاشمی، ڈاکٹر حیدری بابا، پروفیسر کنور شاویز (ملتان) ملک اصغر ساجد لنگراہ (ڈائریکٹر ایل ڈی اے، فیاض قریشی (سعودی عرب) پرویز منیر (لیّہ) مورس نواب بھٹی وشمائلہ مورس شمی، (گوجرانوالہ) ارحم روحان، (میاں چنوں)، شاہ نواز قریشی (لیہ) زاہد وارثی (پاکپتن شریف) خالد خواجہ (ملتان) نجف شاہ (فیاضِ ادب اکیڈمی نارووال) میاں صلاح الدین، گلشن عزیز، احمد فہیم میو، ظلِ ہما نقوی، فوزیہ اعوان، سید ضیا حسین، شیراز انجم، کامران نذیر اور دیگر نے اپنے خوبصورت کلام سے محفل کو گرمایا۔ تقریب میں ڈاکٹر کنول فیروز، عدل منہاس لاہوری، رفعت سعود (ممتاز سماجی کارکن) ضماد گریوال، (ادبی وسماجی کارکن)، عین تمبولوی، سمیرہ بتول، ڈاکٹر محمد رب نواز خانزادہ (سیکریٹری تحریک قوت عوام) فاطمہ قمر (نفاذِ اردو تحریک) امجد تاج خان، طارق واصفی، سہیل رستم، شکیل اعظم، ساجد حسین، سہیل اسلم، چوہدری اکبر علی، ارمغان خلیل، سہیل رجنید اصغر، کرم فانی، ثوبیہ لودھی اور دیگر شاعروں، ادیبوں، صحافیوں، طلبہ اور دانشوروں کی کثیر تعداد نے شرکت فرمائی۔ صابر انصاری اور جمیل ارشد خطاط کو اعزازی شیلڈ پیش کی گئیں۔ اس منفرد اعزازی تقریب کا اختتامیہ شگفتہ غزل ہاشمی (صدر، جگنو انٹرنیشنل) نے کیا بعد ازاں میڈیا سیکرٹری، ممتاز سیاح مقصود چغتائی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اور پھر پُر تکلف چائے کے اہتمام کے ساتھ 2020 کے اُفق پر دوبارہ جلوہ گر ہونے کی امید کے ساتھ 2019 کی یہ اختتامی تقریب اپنے اختتام کو پہنچی۔

ڈاکٹر ثروت زہرا سنبل، لاہور

جگنو انٹرنیشنل آن ایئر

جگنو انٹرنیشنل اور پنج ریڈیو، یو ایس اے کے اشتراک سے متعدد پروگرام آن ایئر ہوئے۔ ایسے ہی پروگرامز میں سے ایک یادگار پروگرام پاکستان سے تعلق رکھنے والی بلند پایہ ادیبہ، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار اور ناول نگار محترمہ بانو قدسیہ کی یاد میں اپنے حسبِ شیڈول ہفتہ وار مشاعرہ/ادبی نشست میں پنج ریڈیو یو ایس اے سے براہِ راست نشر کیا گیا۔ جس کی میزبانی کے فرائض امریکہ سے ڈائریکٹر، پروڈیوسر پنج ریڈیو یو ایس اے محترمہ الماس شمی اور لاہور، پاکستان سے، چیف ایگزیکٹو جگنو انٹرنیشنل ایم زیڈ کنول نے سرانجام دیئے۔ جبکہ پروگرام کو آرڈینیٹر کی حیثیت سے جگنو انٹرنیشنل کے کنوینئر، معروف بینکر، ادب نواز شخصیت محترم سید فردوس حسین نقوی نے بھرپور ادبی فریضہ ادا کیا۔ محترمہ بانو قدسیہ پر گفتگو کے لئے جرمنی سے محترم شفیق مراد، چیف ایگزیکٹو، شریف اکیڈمی، جرمنی نے خصوصی طور پر شرکت فرمائی۔ مزید برآں بانو قدسیہ جو ہر چھوٹے بڑے کی بانو آپا تھیں اور ادب کے گوہر کے ساتھ ساتھ محبتوں اور اخلاقیات کے گوہر لٹاتی رہیں اُن کی یادوں کو اتنے مختصر وقت میں سمیٹنا آسان کام نہیں تھا لیکن پنج ریڈیو کے تعاون سے جگنو انٹرنیشنل کے احباب نے کوزے میں دریا کو سمیٹتے ہوئے بحسن وخوبی یہ امر سرانجام دیا اختر ہاشمی، شگفتہ غزل ہاشمی، صدر، صداقت نقوی، میڈیا کوآرڈینیٹر میانوالی، اور منیر فردوس نے محترمہ بانو قدسیہ کے فن اور شخصیت پر سیر حاصل گفتگو کر کے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ مقررین نے کہا کہ بانو آپا صدی کی نہیں صدیوں کی مصنفہ تھیں، اُن کا نام اور کام ہمیشہ باقی رہے گا اور آنے والی نسلوں کو منزلوں کا پتہ دیتا رہے گا۔۔الماس شمی اور ایم زیڈ کنول نے میزبانی کے فرائض بہت خوبصورت انداز میں نبھائے۔ اُن کی پُر مغز گفتگو کو بہت سراہا گیا فردوس نقوی صاحب نے پروگرام کے آخر میں گفتگو فرماتے ہوئے اس اشتراک پر الماس شمی اور ایم زیڈ کنول کو مبارکباد پیش کی اور محترمہ بانو قدسیہ کی مغفرت اور بلندیء درجات کے لئے بہت عقیدت اور خلوص سے دعا کی جسے بہت پسند کیا گیا۔